حکیم قاری احمد پیلی بھیتی
میرے والد
تحریر و تاثرات
خواجہ رضی حیدر

مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتیؒ

میرے والد

تحریر و تاثرات

خواجہ رضی حیدر

سُورتی اکادمی

کراچی

نام کتاب : مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتیؒ: میرے والد

تحریر و تاثرات : خواجہ رضی حیدر

سرورق : یوسف تنویر

کمپوزر : محمد سلیمان طاہر

سنِ اشاعت : جون 2014ء

طابع : خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز، ناظم آباد نمبر۲، کراچی

ناشر : سُورتی اکادمی، کراچی

رابطہ : 0333-3640643

ای میل : khwajarazihaider@gmail.com

انتساب

مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتیؒ کی چوتھی نسل کے نام

احمد عمران، حمزہ عمران

معظّمہ مخدوم، ساجد مخدوم، سعد مخدوم

مریم محمود، فاطمہ محمود، عائشہ محمود

عائشہ عاطف، محمد عمر عاطف

سلمان یار خان، راہب یار خان

سیدہ فاطمہ بنتِ خواجہ علی حیدر

اللہ تعالیٰ سب کو دین و دنیا کی سلامتی اور

خوشیاں نصیب فرمائے۔ آمین

خواجہ رضی حیدر

حرفِ سپاس

میرے والد کا انتقال ۱۹۷۶ء میں اور والدہ کا انتقال ۱۹۹۱ء میں ہوگیا تھا۔ یہ ہمارے لیے ایک بڑا المیہ تھا جو ہماری روح میں آج بھی زندہ ہے۔ ہم سب بہن بھائی ابّا اور امّاں سے جہاں بے پناہ محبت کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہمارے والدین ہم سے محبت کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی یاد آج بھی ہم کو رُلاتی رہتی ہے۔ میں اپنی والدہ اور والد کی محبتوں اور شفقتوں کو ہمیشہ یاد کرتی رہتی ہوں لیکن اپنی تدریسی اور تحقیقی مصروفیات میں مجھ کو کبھی اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ میں اپنے والدین کی یادوں کو ضبطِ تحریر میں لاسکوں۔ میرے بڑے بھائی خواجہ رضی حیدر جو ایک معروف قلمکار ہیں جب بھی میرے گھر آتے ہیں تو دورانِ گفتگو اماں اور ابا کا ذکرِ خیر بھی ضرور آتا ہے۔ ایسی صورت میں نہ صرف میری بلکہ میرے بچوں کی بھی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ بھائی صاحب ابّا اور امّاں کے بارے میں کچھ ایسا تحریر کردیں جو ہمارے بچوں اور بچوں کے بچوں کے لیے بھی یادگار ہوجائے۔ بھائی صاحب کی اپنی علمی مصروفیات خود اس قدر زیادہ رہی ہیں کہ وہ باوجود خواہش کے کبھی اس جانب توجہ نہیں دے سکے۔ ویسے انہوں نے ہمارے پر دادا حضرت محدث سورتی علیہ رحمہ کی علمی کاوشوں اور سوانحی تفصیلات پر ایک کتاب ''تذکرۂ محدث سورتی'' ۱۹۸۰ء میں لکھی تھی لیکن اب وہ کتاب بھی آؤٹ آف پرنٹ ہے جس کی بنا پر سب کے لیے اس سے استفادہ ممکن نہیں رہا۔ گزشتہ دنوں میں نے بھائی صاحب سے ایک مرتبہ پھر درخواست کی کہ تھوڑا سا وقت نکالیں اور اس کام کو کردیں، کیونکہ سردست خاندان میں کوئی اور ایسا فرد نظر نہیں آتا جو اس کام کو سرانجام دے سکے۔ شکر الحمد للہ۔ اس مرتبہ میری درخواست قبول کرتے ہوئے بھائی صاحب نے ابا کے بارے میں ایک کتاب کی صورت میں اپنے تاثرات قلمبند کردیئے جو یقیناً ابا کی سوانحی اور علمی

ہوچکا خاک کا پیوند شجر
اور آنگن میں ہے سایہ زندہ

زندگی کی تفصیلات کے ضمن میں نہ صرف اہم ہیں بلکہ معلومات افزا بھی ہیں۔ ان تفصیلات کو پڑھ کر کئی مقامات پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میں نے سوچا کہ ہم کتنی چھوٹی عمر میں اس عظیم نعمت سے محروم ہوگئے تھے۔ ابّا کی فرض شناسی اور ہمارے آئندہ کے بارے میں اُن کی فکرمندی ہم پر ایک ایسا احسان ہے جس کو ہم اپنی آخری سانس تک یاد کرتے رہیں گے۔

بھائی صاحب نے اس کتاب کے آخر میں امّاں کے بارے میں بھی اپنے تاثرات پر مبنی ایک مضمون شامل کردیا ہے۔ چند سال قبل جب بھائی صاحب نے یہ مضمون مجھے اور میرے بچوں کو سنایا تھا تو ہماری آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور ہمارے دل امّاں کی عظمت کے احساس سے منور ہوگئے تھے۔ واقعی امّاں فرض شناسی، ممتا اور ایثار کا پیکر تھیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور بھائی صاحب کی ان تحریروں کا اُن کو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اجرِ عظیم فرمائے۔

میری خواہش پر کتاب میں کچھ یادگار دستاویزات اور تصاویر بھی شامل کردی گئی ہیں تاکہ ہماری آئندہ نسلیں اِن سے بصری استفادہ بھی کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری مرحومہ بڑی بہنوں صفیہ قاری اور زاہدہ قاری کی مغفرت فرمائے کہ انہوں نے بھی ابّا اور امّاں کی فرمانبرداری اور دورانِ علالت تیمارداری کا فریضہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے سلسلہ میں ہماری مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے اور ہمارے تمام بہن بھائیوں اور اُن کی اولادوں کی اولادوں کو بھی دین و دنیا کی سرخروئی عطا فرمائے۔ ایک مرتبہ پھر بھائی صاحب آپ کا بے حد شکریہ۔

۲۰ مئی ۲۰۱۴ء

ڈاکٹر راشدہ قاری

C-7، اسٹاف ٹاؤن،

جامعہ کراچی، کراچی

والدین کے لیے نمونۂ عمل کتاب

فی زمانہ والدین اور ان کی اولاد کا تعلق پیچیدہ صورت اختیار کرگیا ہے۔ اس پیچیدگی اور اُلجھاوے کی تمام تر ذمہ داری خود والدین پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کے معنی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ بچوں کی جائز و ناجائز اور وقت بے وقت ہر فرمائش اور ہرضرورت کو پورا کرنا اور کرتے ہی رہنا دراصل محبت ہے۔ والدین کے اِس رویے نے بچوں کے اندر اپنی اہمیت کا بے جا احساس پیدا کردیا ہے اور اب وہ اسی پیمانے سے اپنے والدین اور ان کی محبت کو جانچنے لگے ہیں۔ والدین جب تک اپنے بچوں کے مطالبات اور فرمائشوں کے آگے سر جھکاتے رہیں، وہ اچھے والدین ہیں اور وہ ایسا نہ کریں تو برے ہیں۔ بچوں کی اخلاقی تربیت اور ان کے سیرت و کردار کو سنوارنے کے لیے والدین پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں، وہ ان سے قطعی طور پر غافل ہیں۔ بچوں میں غلط عادتیں پروان چڑھنے لگیں تو ان عادتوں کو چھڑانے کے لیے حسبِ ضرورت ان پر سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ انہیں نظم و ضبط، پابندیٔ اوقات، صفائی ستھرائی، ادب و تہذیب، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے کے آداب، وقت کی قدر و قیمت کا احساس کرنے جیسی معقول صفات پیدا کرنے کے لیے دو صفات خود والدین میں درکار ہوتی ہیں۔ اوّل وہ خود اپنے اندر اوصاف پیدا کریں کہ بچے کانوں سے زیادہ آنکھوں سے سیکھتے ہیں۔ دوئم ان صفات کو پیدا کرنے کے لیے بچوں پر محبت کے احساس کے ساتھ سختی کرنا ضروری ہے۔ بچہ انسانی فطرت کے مطابق ترغیب اور خوف سے ہی مائل بہ اطاعت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے کردار میں اچھے اوصاف پیدا کرنے کے لیے ان دونوں چیزوں سے کام لیا جانا چاہیے۔ وہ اچھے کام کریں تو انعام دیا جائے اور ترغیب سے نہ مانیں تو انہیں سزا دی جائے۔

آج کل گھروں میں بچوں پر سختی کرنے اور سزا دینے کا تو رواج ہی ختم ہوگیا

ہے۔ مغرب کے زیر اثر ہم نے تربیت کا مفہوم یہ سمجھ لیا ہے کہ بچوں میں کسی قسم کا احساسِ محرومی پیدا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ محرومی ان میں کمتری کے احساس اور طرح طرح کے الجھاوے (Complexes) پیدا کردیتی ہے، چناں چہ ان کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے جس کا اثر ساری زندگی رہتا ہے۔ تربیت کے اس مفہوم کے تحت جب والدین بچوں کے اطاعت گزار ہوجاتے ہیں تو جواباً بچوں میں انانیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ والدین کے احکامات ماننے کے بجائے ان پر اپنا حکم چلانے لگتے ہیں اور کبھی ان سے کوئی معقول بات بھی کی جائے تو وہ بجائے بات ماننے کے بحث ومباحثے پر اتر آتے ہیں۔ یہ صورت حال ہر گھر کی ہے۔ پھر یہی بچے جب اس قسم کی ترتیب پاکر پروان چڑھتے ہیں تو والدین ہی کے زیر اثر ان میں یہ احساس یقین کی حد تک پیدا ہوجاتا ہے کہ ان کا کیریئر دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔ چناں چہ وہ اپنے کیریئر اپنے روشن مستقبل کے لیے بوڑھے والدین کو چھوڑ کر امریکا، یورپ یا مشرق وسطیٰ کو سدھار جاتے ہیں اور والدین کی خدمت کا تقاضا بس اسی قدر سمجھتے ہیں کہ ایک لگی بندھی رقم اپنی کمائی میں سے والدین کو بھیج دیا کریں اور بس۔ تب یہی والدین اپنے بچوں سے گلہ مند بھی ہوتے ہیں اور ان کی بے التفاتی اور بے حسی کی شکایتیں ملنے جلنے والوں سے کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے ہیں۔

اس صورت حال کا مداوا کیسے کیا جائے۔ یہ مسئلہ ایک عرصے سے معما بنا ہوا تھا، کیوں کہ ہمارے نزدیک بچوں کی تربیت سے پہلے والدین کی تربیت ضروری ٹھہری۔ پہلے والدین کو تو معلوم ہو کہ انہیں بہ حیثیت والدین کیسا ہونا چاہیے؟ ان پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں؟ انہیں بچوں کی تربیت کیسے کرنی چاہیے؟ ان کی کون سی فرمائش پوری کرنی چاہیے اور کن مطالبات کو بہترین طریقے سے سمجھا بجھا کر رد کرنا چاہیے؟ عجیب بات یہ ہے کہ آج کی مقبول عام اصطلاح میں لوگ باگ معاشرے میں ''رول ماڈل'' تلاش کرتے ہیں، حالاں کہ گھروں کے اندر والدین کو ''رول ماڈل'' ہونا چاہیے۔ انہیں اخلاق و کردار کا مضبوط، محبت وایثار کا حامل، سمجھ بوجھ میں طاق اور معاملات میں حسن معاملہ کرنے والا ہونا چاہیے۔ بچے ویسا ہی بن جاتے ہیں جیسے والدین خود ہوتے ہیں۔ اب پھر وہی سوال ہے کہ والدین کو ''اچھا'' کیسے بنایا جائے۔ اس کا بھی اصول وہی ہے کہ بچے جس طرح والدین کو دیکھ کر سیکھتے ہیں، بالکل اسی طرح والدین، ''اچھے'' والدین کی مثال کو اپنے سامنے رکھیں، ان سے سیکھیں اور ان ہی جیسا خود کو بنانے کی کوشش کریں۔

خواجہ رضی حیدر صاحب جو ایک کثیر التصانیف، مصنف، محقق اور شاعر ونقاد کی حیثیت سے ملک کے ادبی وعلمی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں، ان کی زیر نظر کتاب جو دراصل ان کے والد گرامی حضرت مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتیؒ کے تعارف و تذکرے پر مشتمل ہے، اسی کتاب کے آخر میں انہوں نے ایک مضمون ''آغوش سے دُور'' اپنی والدہ ماجدہ پر بھی شامل کیا ہے، اس کتاب میں خواجہ صاحب نے نہایت دل نشین انداز میں اپنی تربیت اور برتاؤ کے حوالے سے مختلف واقعات کی روشنی میں اپنے والدین کے مزاج، ان کی نیک نفسی اور ان کی اعلیٰ انسانی صفات کا نقشہ کھینچا ہے۔ انہوں نے دکھایا ہے کہ جب خواجہ صاحب میں اوائل عمری میں بری عادتوں کی لت لگنی شروع ہوئی تو ان کے والد نے اس کا تدارک کتنی محبت اور سلیقے سے کیا۔ یقیناً مجھے خواجہ رضی حیدر صاحب کو داد دینی چاہیے کہ انہوں نے نہایت اخلاقی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ''عیوب'' کو بلاتکلف عیاں کردیا ہے اور اس بیان میں وہ ذرا بھی نہیں جھجکے۔ میں تو اسے بھی ان کے والد گرامی کی تربیتِ فیض کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔

اہل قلم میں ممتاز حیثیت کا حامل ہونے کے باوجود مولانا حکیم قاری احمد کی

طبیعت، شہرت و ناموری سے وحشت زدہ اور بیزار رہتی۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے وصال کی خبر اخباروں میں اپنے بیٹے خواجہ رضی حیدر کے حوالے سے شایع ہوئی۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہمارے ہاں اخبار نویسوں کے لیے پڑھالکھا ہونا یا وسیع المطالعہ ہونا قطعی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ رپورٹر اسے کہتے ہیں، جو خبر بنالیتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات بڑے بڑے ادیبوں، عالموں اور علمائے حق کی موت کی خبریں یا تو اخبارات میں چھپتی نہیں ہیں یا غیر اہم طریقے سے شایع ہوتی ہیں۔ حکیم قاری احمد پیلی بھیتیؒ نے تو گوشۂ گمنامی میں زندگی گزاری۔ لیکن زندگی ایسی گزاری کہ فرشتے بھی رشک کریں۔ ان کی حیات ایک والد ہی کے لیے نہیں، ایک انسان اور ایک مسلمان کے لیے بھی نمونۂ عمل ہے، اسی طرح والدہ مرحومہ پر خواجہ صاحب نے جس والہانہ طریقے سے اپنے جذباتِ عقیدت و محبت کی ترجمانی اپنے مضمون میں کی ہے، میں تو اسے پڑھ کر آب دیدہ ہوگیا۔ غالباً ہر حساس قاری کی یہی کیفیت ہوگی۔ ایک اضافی بات یہ کہ خواجہ صاحب کی والدہ ماجدہ میں آج کی ''ماڈرن بیویوں'' کے لیے بھی سیکھنے اور سمجھنے کے بڑے پہلو ہیں۔ ایک بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا اور کیسی اطاعت شعاری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ سب باتیں ان کے کردار میں نہایت پر اثر طریقے سے جھلکتی نظر آتی ہیں۔

ان تمام باتوں کی وجہ سے میں اس کتاب کی اشاعت کو ایک اہم واقعہ سمجھتا ہوں۔ اور خداوند تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اس کتاب کو مقبولیت کے ساتھ لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

۲رجون ۲۰۱۴ء

ڈاکٹر طاہر مسعود

چیئرمین، شعبۂ ابلاغِ عامّہ

جامعہ کراچی

میرے والد

میرے والد مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی کا وصال ۱۴رمئی ۱۹۷۶ء بروز جمعہ ہُوا تھا۔ اُس وقت میری عمر تیس سال تھی اور میں تقریباً دس سال سے ایک اخبار روزنامہ ''حریت'' کراچی سے وابستہ تھا۔ برسرروزگار ہونے کے باوجود میں نے کبھی خود کو مالی معاملات میں خود مختار تصور نہیں کیا۔ اپنی ہر ضرورت کے لمحہ میں اپنے والد جن کو میں ''ابّا'' کہا کرتا تھا اُن کی ہی طرف دیکھا۔ ایسی صورت میں اچانک ابّا کا حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال میرے لیے ایک ایسا سانحہ اور المیہ تھا کہ آج عمر کی ۶۸ بہاریں دیکھنے کے باوجود یہ المیہ میری روح میں ہنوز تازہ ہے اور میں ہر لمحہ ابّا کی شخصیت، انتظامی صلاحیتوں اور اُن کی پدرانہ شفقت کو یاد کرکے آنسو بہاتا رہتا ہوں۔ ابتدائی چند ماہ تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اس دنیا سے رُخصت ہوکر اللہ کی رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ دروازہ پر ہر دستک اور گلی کے موڑ سے ساعت میں آتی ہوئی قدموں کی ہر چاپ پر یہ گمان گزرتا تھا کہ شاید ابّا آرہے ہیں۔ مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ کون ابدالآباد سے لوٹ کر آتا ہے۔ بس یادیں تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ سو میرا بھی یادیں تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ رخصت ہوجانے والے چہروں کا ایک ہجوم ہے جو آنکھوں کو خشک اور یادوں کو مضمحل ہونے ہی نہیں دیتا۔ ابّا کی زندگی میں کبھی میں سوچتا تھا کہ کاش میرے پر دادا مولانا وصی احمد محدث سورتی علیہ الرحمۃ

اور میرے دادا سلطان الواعظین مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی علیہ رحمۃ میری پیدائش سے قبل انتقال نہ فرماتے تو میرے حافظہ میں اُن کے خال و خد بھی محفوظ ہوتے اور میں اُن کے تصور میں رہا کرتا۔ کیونکہ ابّا اتنے مؤثر اور دلنشین انداز میں اپنے والد اور دادا کا تذکرہ کیا کرتے تھے کہ اکثر یہ تذکرہ آہوں اور سسکیوں پر ختم ہوتا تھا۔ اسی تذکرے نے میرے اندر اپنے اجداد اور اَسلاف سے تعلق اور محبت کے ایسے سرمدی چشمے بہادیئے کہ آج بھی میں انہی چشموں کے ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں سے اپنی رُوح کو سیراب کرتا اور اپنی معصیت کوشیوں پر کف افسوس ملتا رہتا ہوں۔ ایسی صورتحال میں صرف ابّا کا تصور ہی میرا غمگسار بھی ہوتا ہے اور میرا دلدار بھی۔ ہر لمحہ مجھے خیال آتا ہے کہ ابّا کے انتقال کو ۳۸ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور میں نے اپنے ذوق وشوق کی ہمرہی میں متعدد کتابیں اور لاتعداد مضامین قلمبند کیے ہیں لیکن باوجود خواہش اور کوشش کے میں ابّا کے حوالے سے کچھ نہیں لکھ سکا۔ ایسا کیوں ہوا۔ یہ سوال میرے اندر ملامت کو فروغ دیتا ہے اور ارادہ کو تقویت۔ لہٰذا میں اپنے ماضی کے ایامِ دلنواز کی سیر پر نکل جاتا ہوں۔

مجھے اپنے بچپن کی یادیں آواز دینے لگتی ہیں۔ میں مغرب کے بعد کراچی کے ایک محلے کھارادر کی ایک معروف سڑک ینگ ہسبینڈ روڈ پر پنجابی کلب کے بالمقابل واقع ایک عمارت منگامل مولچند بلڈنگ کی پہلی منزل کے ایک فلیٹ کی گیلری میں بیٹھا ہوا مچھی میانی روڈ کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں جہاں سے ابّا مطب سے فارغ ہوکر گھر آیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس وقت میں یعنی اکتوبر ۱۹۵۱ء میں ''کچی پہلی'' جماعت میں تھا۔ نئی کتاب اور نئے کپڑے کا تھیلا نما وہ بستہ میرے حافظہ میں ابھی تک محفوظ ہے جس میں عمر کے ساتھ کتابوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔

دوسری جماعت میں پہنچا تو میرے نصاب میں چار کتابیں شامل تھیں اور جب ابّا یہ کتابیں مجھ کو دلا کر گھر لائے تھے تو اُس رات میں ان کتابوں کی کوری خوشبو اور تصاویر سے بہت دیر تک محظوظ ہوتا رہا تھا۔ اتنی دیر تک کہ ابّا مطب سے واپس آجاتے۔ ابّا کی مطب سے واپسی کا منظر بھی خوب ہوتا تھا۔ میں اپنی کتابیں گیلری میں پھیلائے بیٹھا رہتا تھا۔ پھر سڑک پر دم توڑتی ہوئی چہل پہل اور سائیکل رکشاؤں کے پیڈلوں اور چین کی مدھم پڑتی ہوئی کراہٹوں کے درمیان سے مجھے ابّا کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی اور میں دیوانہ ہوجاتا تھا۔

ابّا سڑک پار کرکے سامنے والی فٹ پاتھ پر آجاتے۔ علی گڑھ کاٹ پائجامہ، شیروانی، مخمل کی مراد آبادی سیاہ ٹوپی میں وہ کتنے وجیہہ نظر آتے تھے۔ کسرتی بدن، لانبا قد اور چہرے پر خوبصورت منڈھی ہوئی ڈاڑھی، کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ گیلری کے قریب آتے تو میں اُن کی آمد کی خوشی میں آدھے سے زیادہ گیلری سے لٹک جاتا اور ابّا گیلری کے نیچے رُک کر زور سے مجھ سے کہتے ''پیچھے ہٹو۔ کیا بے وقوفی ہے''۔ میری اُچھل کود اور خوشی سے اَمّاں سمجھ لیتیں تھیں کہ حکیم جی آگئے ہیں۔ وہ پلنگ پر سوئی ہوئی میری چھوٹی بہن شاہدہ کے پہلو سے اُٹھ کر اپنا ڈوپٹہ سر سے اوڑھ لیتیں اور میں دوڑ کر دروازہ کھول دیتا۔ ایسا لگتا تھا کہ ابّا گھر میں اکیلے داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ اُن کے ساتھ چھما چھم کرتی ہوئی بہت سی خوشیاں اور ڈھیر سارا تحفظ گھر میں آگیا ہے۔ اَمّاں مسکراتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی جاتیں اور ابّا جب پلنگ پر بیٹھ جاتے تو میں جلدی جلدی اُن کے جوتے موزے اتارتا اور پلنگ کے نیچے سرکا دیتا۔ ابّا شیروانی کھونٹی پر ٹانگتے اور ٹوپی اتار کر سامنے تپائی پر رکھ دیتے۔ اس دوران اَمّاں فرش پر چٹائی بچھا کر دسترخوان مجھے پکڑا دیتی

تھیں اور خود کھانا نکالنے چلی جاتیں۔ ابّا، امّاں سے میری بہن کے لیے پوچھتے ''اشرف کب سوئی'' پھر سوال کرتے ''اُس نے کھانا کھالیا''۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہتے ''تو کیوں نہیں سوتا، بغیر کھائے پیے اس وقت تک جاگتا رہتا ہے۔ روزانہ صبح اسکول کے لیے اٹھانا پڑتا ہے''۔ پھر بہت شفقت سے میرے بال بکھیر دیتے۔ روز کا یہی معمول تھا اور اسی معمول کے اتار چڑھاؤ میں زندگی کئی گھاٹ اُتر گئی۔

جڑواں بھائی۔ فضل احمد صوفی

منگامل مولچند بلڈنگ کا یہ فلیٹ میرے والد نے ۱۹۴۸ء میں اپنے آبائی شہر پیلی بھیت سے ترک مکانی کے بعد کراچی پہنچ کر حاصل کیا تھا۔ اسی فلیٹ سے متصل دوسرے فلیٹ میں میرے والد کے جڑواں بھائی فضل احمد صوفی اپنی بیگم اور ایک بیٹے معین احمد کے ساتھ مقیم تھے۔ وہ بمبئی سے کراچی پہنچے تھے اور ''ٹی بی'' کے مریض تھے۔ اُن کے بمبئی میں قیام کی وجہ بعد میں میرے علم میں یہ آئی تھی کہ انہوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد خاندانی علمی روایت سے ناطہ توڑ کر کانپور کے حلیم مسلم اسکول میں داخلہ لے لیا تھا اور ''درس نظامی'' کی تکمیل کے بجائے میٹرک کرلیا۔
اپنے آبائی شہر سے دوری اور انگریزی تعلیم کے حصول کی بنا پر اُن کے چہرے پر سجی ہوئی اسلاف کی نشانی یعنی ''داڑھی'' مختصر ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی تھی۔ ابّا کے بیان کے مطابق: ''خاندان کے افراد نے انگریزی تعلیم کے حصول پر تو زیادہ واویلا نہیں کیا البتہ ڈاڑھی منڈوانے پر سب چراغ پا ہوگئے۔ کسی نے کہا محدث صاحب کا پوتا اور ڈاڑھی منڈوادے اور کسی نے کہا کہ اب کس منہ سے پیلی بھیت واپس آئے گا۔ نتیجہ یہ کہ فضل احمد صوفی نے پیلی بھیت واپسی کا خیال دل سے نکال کر پہلے

آگرہ میں اور بعد میں بمبئی میں سکونت اختیار کرلی۔ عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی سے واقفیت نے علم و ادب کی راہ پر ڈال دیا۔ اُن کے سگے خالو سیّد اوصاف علی ریلوے میں گارڈ تھے اور فضل احمد صوفی سے بے پناہ محبت کرتے تھے لہٰذا انہوں نے ریلوے میں ایک درخواست لگادی اور فضل احمد صوفی بمبئی ریلوے کے ٹائم آفس میں کلرک ہوگئے۔ روزگار کا مسئلہ تو حل ہوگیا مگر وہ جو علم کی پیاس تھی اپنی جگہ برقرار رہی۔ ابتداً اخبارات میں مضامین لکھتے رہے، پھر معروف صحافی اللہ بخش یوسفی کے ہفت روزہ انگریزی اخبار ''دی پروگریس'' میں ایڈیٹوریل رائٹر کی جزوقتی ملازمت اختیار کرلی۔ فضل احمد صوفی کو انہی اللہ بخش یوسفی کی قربت میں تحریک پاکستان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انہوں نے متعدد معرکہ آرا مضامین تحریک پاکستان کی حمایت میں لکھے۔ اُن کو علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح سے شدید لگاؤ تھا۔ خصوصاً قائد اعظم پر تو جان دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قیامِ پاکستان کے بعد ریلوے کے ملازم کی حیثیت میں انہوں نے پاکستان کے لیے option دیا اور کراچی پہنچ کر اُسی محلّہ میں رہائش اختیار کی جہاں قائد اعظم پیدا ہوئے تھے۔ خون تھوکنے اور شدید نقاہت کے باوجود ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو ماری پور کے ہوائی اڈہ پر پہنچ کر قائد اعظم کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہوئے۔ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو انتقالِ اقتدار کی تقریبات دیکھیں۔ خوب نعرے لگائے اور ایک نعرہ پر منہ سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ اُس عالم شادمانی میں بڑی مشکل سے کوئی اجنبی آمادہ ہوا اور اُن کو گھر تک پہنچایا۔ روز بروز حالت بگڑتی چلی گئی''۔
ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہونے والے قتل عام اور لوٹ مار کی خبروں نے کراچی کی پرامن فضاؤں کو مسموم کردیا اور یہاں بھی فسادات کی آگ بھڑک

اُٹھی۔ تحریک پاکستان کے ایک کارکن کے لیے نوزائیدہ مملکت میں یہ خونریزی شدید صدمہ کا باعث تھی۔ قائداعظم بھی اس صورتحال سے شدید دلبرداشتہ تھے اور انہوں نے جذبات پر قابو رکھنے کے لیے عوام سے متعدد بار اپیل کی۔ پھر جب حالات معمول پر آئے تو خود قائداعظم بیمار پڑگئے اور اس مرتبہ یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ فضل احمد صوفی سے ۱۱رستمبر ۱۹۴۸ء کی شب قائداعظم کے انتقال کی خبر چھپائی گئی مگر صبح یہ خبر عام ہوگئی۔ شدید کمزوری اور نقاہت کے باوجود انہوں نے قائداعظم کی نمازِ جنازہ میں شریک ہونے پر اصرار کیا۔ بھائی نے روکنے کی کوشش کی مگر پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ گورنر جنرل ہاؤس سے نمائش تک جلوسِ جنازہ میں شمولیت اور غم و اندوہ کی فراوانی نے ایک مرتبہ پھر سینہ کھرچ دیا اور واپسی پر خون کی ایک شدید قے ہوئی اور بلدیہ کراچی کے سامنے فٹ پاتھ پر غش کھا کر گر پڑے۔ بس زندگی یہاں تک اپنے پیروں پر چلی اور اُس کے بعد ۴ردسمبر ۱۹۴۸ء کو ہمیشہ کے لیے رُک گئی۔

مولانا فضل احمد صوفی کے انتقال کے وقت اُن کا ایک بیٹا معین احمد تھا جو اپنی والدہ کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں ہندوستان واپس چلا گیا۔ معین احمد نے ہندوستان یعنی اپنے آبائی شہر پیلی بھیت میں شدید عسرت کے عالم میں بھی اپنی پڑھائی پر توجہ دی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بورڈ سے بی اے کی سند حاصل کی۔ بعد میں وہ تجارت کی طرف راغب ہوئے لیکن کوئی نمایاں کامیابی نہ ہونے کی بنا پر اپنے آبائی پیشے یعنی درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ معین احمد کی شادی ۱۹۸۳ء میں شاجہاں پور کے شجاعت احمد خاں کی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوئی۔ چار اولادیں ہیں۔ مدیحہ معین، یاور اسلام، بابر اسلام اور بلال اسلام، سب بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سب برسرِ روزگار ہیں۔ مدیحہ معین کی شادی ہوچکی ہے۔ معین احمد صوفی کا انتقال

۳رفروری ۲۰۱۴ء کو پیلی بھیت میں ہوا اور آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

میرے والد کو اپنے بھائی فضل احمد صوفی سے شدید محبت تھی۔ ویسے بھی دونوں جڑواں پیدا ہوئے تھے، اس لیے شکل وصورت اور عادات و اطوار میں بھی بلا کی یکسانیت تھی۔ مولانا فضل احمد صوفی نے جون ۱۹۴۶ء میں اپنے ایک مضمون ''توام بچے'' مطبوعہ ماہنامہ نگار لکھنؤ میں جڑواں بچوں کی نفسیاتی مماثلت پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی اور اپنے بھائی کی مماثلت و مشابہت کا بہت تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''ہم دونوں بھائیوں کی شادی ہوچکی ہے اور دونوں ایک ایک بچے کے باپ ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت ہے جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن باوجود اس مماثلت اور یکسانیت کے یہ کہنا کہ جب اس دنیا سے روانگی کا وقت آئے گا تو ہم ساتھ ہی ساتھ سفر کریں گے یہ بہت دشوار ہے۔ بہرحال اگر ایسا ہوا بھی تو ہم دونوں کا سرِتسلیم خم ہے''، لیکن ایسا ہوتا کب ہے مولانا فضل احمد صوفی ۴ردسمبر ۱۹۴۸ء بروز ہفتہ چار بجے سہ پہر اس دنیا سے رخصت ہوکر اللہ کی رحمت میں پہنچ گئے اور میرے والد اُن کی میت پر آنسو بہاتے رہ گئے۔ اَبّا نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ''پہلے دنیا میں آنے والا پہلے رخصت ہوگیا اور بعد میں آنے والا اٹھائیس سال بعد یہ تذکرہ لکھ رہا ہے۔ دو گھنٹے کا وہ فرق جو ہم دونوں کی پیدائش میں تھا، آج تین دہائیوں پر پھیل گیا ہے۔ یہ فرق نہیں دراصل ایک لمحۂ فراق ہے جو مجھے صدیوں پر محیط نظر آتا ہے''۔

ایک نئی زندگی کا آغاز

ایک سفر ختم ہوا تو دوسرے سفر کا آغاز ہوگیا۔ بھائی کی تجہیز و تکفین سے فارغ

ہوکر میرے والد مولانا حکیم قاری احمد نے جب گھر کی طرف دیکھا تو ذمہ داریوں اور مسائل کا ایک ہجوم تھا۔ بیروزگاری کا احساس بہت جلد بھائی کے غم پر حاوی آ گیا۔ تین چھوٹے بچوں اور بیوی کے علاوہ بھائی کی بیوہ اور بچہ بھی حسرت بھری نگاہ سے اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حالات ایسے تھے کہ نہ علم دین ہی روزگار کا وسیلہ ثابت ہورہا تھا اور نہ طبابت۔ کیسی صحت اور کیسا مذہب۔ ہر شخص نوزائیدہ مملکت کے دارالخلافہ کراچی میں اپنے پیر جمانے کی فکر میں منہمک تھا۔ نہ کسی کو کسی سے حال پوچھنے کی فرصت تھی اور نہ اظہارِ ہمدردی کی۔ سب اپنی نبیڑنے میں لگے ہوئے تھے۔

اسی زمانہ میں جبکہ بھائی کی موت، بیوی کی بیماری، بیروزگاری اور اجنبی در و بام کی وحشت نے حواس معطل کررکھے تھے ایک ناگہانی نے گھر میں کہرام برپا کردیا۔ ابا کو ایک ناکردہ جرم کے الزام میں پولیس نے داخلِ حوالات کردیا۔ ابّا کی گرفتاری کے بعد دو چھوٹے بچے لیے ہوئے میری والدہ عالمِ بے چارگی میں دروازے کھٹکھٹاتی پھریں مگر کوئی دستگیری پر آمادہ نہیں ہوا۔ اسی دوران ہمارے فلیٹ سے متصل بلڈنگ میں مقیم کراچی کے ایک قدیم باشندے غلام رسول سومرو نے والدہ کی پریشانی کا احساس کرتے ہوئے تھانے جاکر والد کی شخصی ضمانت کرائی۔ یہی نہیں بلکہ اُس شخص نے کچھ رقم بھی بطور قرضِ حسنہ والد کو دی تاکہ وہ اس رقم سے اپنے روزگار کا کوئی ذریعہ پیدا کریں۔ ایک جگہ غلام رسول سومرو کا تذکرہ کرتے ہوئے ابّا نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ پاکستان کی سرزمین پر میرے خاندان کا یہ شخص پہلا محسن تھا اِس لیے میں ہمیشہ دعا میں اُس کو یاد رکھتا ہوں۔

میرے والد کی ڈائریوں سے پتہ چلتا ہے کہ کراچی آنے کے بعد انہوں نے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سرمہ اور مسواک بھی بیچا اور کتابوں کی ایک دکان پر بطور سیلز مین

نوکری بھی کی۔ اِسی دوران ایک مسجد میں تقریر کا موقع ملا اور انہوں نے اپنے زورِ خطابت سے مسجد کمیٹی کا دل جیت لیا۔ پچاس روپے ماہانہ پر مسجد کی امامت ایک بے روزگار شخص کے لیے نعمت سے کم نہ تھی فوراً قبول کرلی۔ مسجد سے وابستگی اور جمعہ کی خطابت نے نہ صرف ہردلعزیزی کو فروغ دیا بلکہ بحیثیت واعظ شہرت عام ہونے لگی۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں مولانا عبدالحامد بدایونی کے ایما پر ایک رسالہ ماہنامہ ''الاسلام'' کی ادارت مل گئی اور لکھنے کا وہ سلسلہ جو پیلی بھیت سے ترک مکانی پر تعطل کا شکار ہوگیا تھا ازسرنو شروع ہوگیا۔ جمعیت علما پاکستان کے پلیٹ فارم سے تقاریر کا موقع ملا اور شناسائی کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اقتصاد کی کچھ صورتحال بہتر ہوئی۔ فضل احمد صوفی کی بیوہ نے کچھ دن ساتھ گزارے پھر وہ اپنے بیٹے معین احمد کو لیکر پیلی بھیت لوٹ گئیں۔ ادھر ایک مقتدی نے جو برص کے مرض کا شکار تھا ابّا کے ہاتھوں شفا پائی اور کاغذی بازار میں واقع اپنی ایک دکان میں مطب کھولنے کی اجازت دیدی۔ خطابت، ادارت اور طبابت نے روز و شب کے آنچل میں کشادگیٔ رزق کے سلمیٰ ستارے ٹانک دیئے۔ اشرف کو رونقِ اسلام گرلز اسکول اور مجھ کو گورنمنٹ بوائز اسکول کاغذی بازار میں داخلہ دلا دیا گیا۔ کھارادر کی مدینہ مسجد میں ہم دونوں بہن بھائی دوپہر کے وقت قرآن شریف پڑھنے جانے لگے۔

میرے والد کے دادا: حضرت محدث سورتی رحمۃ اللہ علیہ

میرے والد مولانا حکیم قاری احمد کے دادا حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی علیہ رحمہ کا شمار زوال آمادہ ہندوستان کے اہم ترین محدثین میں ہوتا ہے۔ وہ مسلک کے اعتبار سے حنفی اور نسب کے اعتبار سے علوی تھے یعنی حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد

تھے اور اسی بنا پر اپنے نام کے ساتھ حُنیفی وحنفی لکھا کرتے تھے۔ مولانا وصی احمد محدث سورتی کے اساتذہ میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور استاذ الاساتذہ تھے۔ حضرت محدث سورتی کو شرف بیعت اولیس دوراں حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی علیہ رحمہ سے حاصل تھا۔ جو اٹھارویں صدی عیسوی میں نقشبندیہ مجددیہ سلسلہ کے بزرگ ترین پیر طریقت تھے اور اُس دور کے بیشتر علما اُن کے ہی دست حق پر بیعت ہوا کرتے تھے۔ اپنے پیرومرشد کے ہی حکم پر حضرت محدث سورتی نے یوپی کے شہر پیلی بھیت میں درس و تدریس کا آغاز کیا اور مدرسۃ الحدیث کی بنیاد رکھی۔

حضرت محدث سورتی علیہ رحمۃ نے مدرسۃ الحدیث پیلی بھیت میں تقریباً چالیس سال درس حدیث دیا۔ حدیث وفقہ کی متعدد کتابوں پر اُن کے حواشی آج بھی یادگار ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں مولانا ضیاء الدین مدنی، مولانا امجد علی اعظمی، مولانا ظفر الدین بہاری، پروفیسر سیّد سلیمان اشرف، مولانا سیّد محمد محدث کچھوچھوی اشرفی، مولانا مشتاق احمد کانپوری، مفتی عبدالقادر لاہوری، مولانا ضیاء الدین پیلی بھیتی، مولانا خادم حسین محدث علی پوری وغیرہ علمی حلقوں میں معروف ہوئے۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ''تذکرہ محدث سورتی'') بعد میں حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کی پڑنواسی حمیدہ خاتون سے حضرت محدث سورتی کے فرزند ارجمند حضرت مولانا عبدالاحد پیلی بھیتیؒ (پیدائش ۱۸۸۳ء) کی شادی ہوگئی اور یہ روحانی نسبت قرابت داری میں بدل گئی۔ مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی امام اہلسنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ رحمہ کے مرید وخلیفہ تھے اور اعلیٰ حضرت نے اُن کو بے مثال خطابت کی بنا پر سلطان الواعظین کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ مولانا

عبدالاحد پیلی بھیتی کے تین صاحبزادے تھے۔ مولانا شاہ فضل الصمد مانا میاں (پیدائش ۲۷/اکتوبر ۱۹۰۹ء، بروز بدھ)، مولانا شاہ فضل احمد صوفی اور مولانا شاہ فضل محمد قاری (پیدائش ۲/دسمبر ۱۹۱۱ء، بروز بدھ)، آخر الذکر جڑواں بھائی تھے۔ ایک خاندانی روایت کے مطابق ان صاحبزادوں کی ولادت چونکہ گنج مرادآباد میں ہوئی تھی اس لیے ان کی نانی یعنی حضرت شاہ فضل رحمان علیہ رحمہ کی نواسی صدیقہ بیگم نے تینوں بچوں کے نام اپنے نانا کی نسبت سے رکھے جبکہ بچوں کے مزاج کی بنا پر کنیت کا اضافہ کیا۔ شاہ فضل الصمد چونکہ پیدا ہونے کے بعد ضد بہت کرتے تھے اس لیے اُن کے نانا شاہ عبدالکریم گنج مرادآبادی اپنی اہلیہ سے اکثر تاکید کرتے کہ اس کی ''مان'' لو۔ سو اُن کی کنیت ''مانا'' ہوگئی، جبکہ شاہ فضل احمد خاموش طبع تھے اس لیے ''صوفی'' پکارے جانے لگے جبکہ میرے والد شاہ فضل محمد حلق سے روتے تھے اس لیے ''قاری'' کہلائے جانے لگے۔ بعد میں یہی کنیت اُن کے نام کا حصہ بن گئی اور وہ نہ صرف قاری احمد ہوگئے بلکہ انہوں نے باقاعدہ قرأت سیکھی۔

گنج مرادآباد اُناؤں ڈسٹرکٹ میں پیدائش کے بعد ابّا نے پیلی بھیت میں پرورش پائی۔ پیلی بھیت بھارت کے صوبے یوپی میں بریلی سے تقریباً ۳۵ میل کے فاصلے پر ہمالہ کی ترائی اور نیپال کے نیچے ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ کسی زمانے میں اس شہر پر بنجاروں کی حکومت تھی۔ ۱۷ ویں صدی عیسوی میں مشہور سپہ سالار حافظ رحمت خاں روہیلہ نے اس علاقہ کو فتح کرکے اپنی حکومت قائم کی۔ حافظ رحمت خاں نے بریلی، مرادآباد، رام پور، بدایوں، بجنور، شاہجہاں پور وغیرہ کو بھی فتح کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا تھا، اس لیے یہ تمام علاقے روہیلکھنڈ کے نام سے معروف ہوئے۔ پیلی بھیت کے اطراف میں ایک دیوار قدیم سے تھی جو

پیلی مٹی کی بنی ہوئی تھی اس لیے یہ شہر پیلی بھیت کے نام سے مشہور ہوا۔ ہندی اور سندھی میں ''بھت'' دیوار کو کہتے ہیں جسے اُردو نے ''بھیت'' کردیا۔

شاہ مانا میاں قادری چشتی

ابّا کے برادرِ بزرگ شاہ فضل الصمد مانا میاں قادری چشتی درس نظامی کی تکمیل کے بعد وعظ وتقریر کی طرف راغب ہوگئے۔ سلسلۂ قادریہ میں وہ حجت الاسلام شاہ حامد رضا خان بریلوی سے اور چشتیہ ونقشبندیہ سلسلہ میں اپنے والد مولانا عبدالاحد قادری سے بیعت تھے، لہٰذا والد کے انتقال کے بعد حضرت محدث سورتی کے سلسلہ کو آگے بڑھانے میں مصروف رہے۔ سیاست میں بھی حصہ لیا لیکن درویشی اور تصوف کے غلبہ نے گوشہ نشینی کی طرف مائل رکھا۔

حضرت شاہ مانا میاں قادری چشتی پیلی بھیتی پر اپنے انتقال سے تقریباً بیس سال قبل کثرتِ اوراد و وظائف کی بنا پر وارفتگی اور سکر وصحو کا وہ عالم طاری ہوتا کہ ہفتوں کسی سے ملاقات نہ کرتے۔ ہر وقت رقت طاری رہتی۔ بعض اوقات استغراق و جذب کی ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ حال سے بے حال ہوجاتے تھے۔ آپ کی قبولیت و مرجعیت اور کشف و کرامات کا شہرہ دُور ونزدیک عام تھا۔ ہر وقت اُن کی خانقاہ کے باہر سائلین کا ہجوم رہتا اور سب کامیاب و بامراد واپس جاتے۔ کانپور، بمبئی، لکھنؤ، بریلی، مراد آباد و بدایوں کے مجاذیب آپ کو احترام و قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُن کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریا تھی۔ طمع و لالچ سے کوسوں دور تھے۔ رؤسا اور اہل اختیار سے کنارہ کش رہتے اور غربا سے قربت والتفات کا مظاہرہ کرتے۔ اُن کی خانقاہ کے باہر اوباشوں اور بدکرداروں کا ہجوم رہا کرتا تھا جس کی بنا

پر علمائے شہر اور معززین کو اعتراض ہوتا تھا مگر کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ۱۹۷۹ء میں جب میں پیلی بھیت حاضر ہوا تو مانا میاں صاحب کے معتقدین کے علاوہ معترضین بھی مجھ سے ملاقات کو آتے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق گفتگو کرتا تھا لیکن اُن کی شخصیت کی روحانی حیثیت کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں کرتا تھا اور جو بات کرتے تھے وہ اُن کو عارف باللہ قرار دیتے تھے اور عجیب عجیب خارق عادت واقعات وکرامات سناتے تھے۔ ایک دن میں نے مولانا عبدالحئی پیلی بھیتی کے صاحبزادے رابعی میاں سے جو میرے چچا اور مانا میاں کے چچازاد بھائی تھے اس صورتحال کے بارے میں گفتگو کی تو انہوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ ''مانا میاں صاحب کے پاس عموماً پست مزاج و قماش کے افراد موجود رہتے تھے اور میاں بھی اُن کی دلجوئی و مدارات کرتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے مانا میاں صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس ہمیشہ یہی افراد موجود رہتے ہیں، علماء اور شرفا کم نظر آتے ہیں۔ میری بات سن کر مانا میاں نے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا اور فرمانے لگے ''دیکھو بھائی نئے ماڈل کی موٹریں بنانے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔ ہم تو گیراج چلانے والے موٹر میکینک ہیں۔ ہمارے پاس تو تم کو ٹوٹی پھوٹی اور خراب موٹریں ہی نظر آئیں گی۔ نئی موٹروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ ہمارے گیراج پر آئیں''۔ رابعی چچا نے مجھے بتایا کہ بعد میں میری نظر میں ایسے متعدد افراد آئے جو پہلے بدکردار و بدقماش تھے لیکن مانا میاں صاحب کی صحبت اور توجہ سے اُن کی زندگی بدل گئی اور وہ شرفا سے زیادہ محترم تصور کیے جانے لگے۔ ۳۱رجنوری ۱۹۷۷ء کو مانا میاں صاحب کا پیلی بھیت میں وصال ہوا۔ برصغیر کے نامور صوفیا کے حوالے سے چند کتابیں یادگار ہیں۔

پیلی بھیت سے محبت

آبائی وطن پیلی بھیت سے نقل مکانی کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کرنے کے باوجود ابّا کا دل ہمیشہ پیلی بھیت میں آباد رہا۔ نظریۂ پاکستان کی نصرت اور پاکستان کے قیام کی از حد خوشی بھی اُن کے دل سے کبھی پیلی بھیت کی محبت کو بے دخل نہیں کرسکی۔ آدمیوں سے لیکر لب و لہجہ تک، آب و ہوا سے لیکر لباس تک، پھلوں سے لیکر اشجار اور پرندوں تک ہر شے میں وہ پیلی بھیت سے مناسبت تلاش کرتے رہتے تھے۔ اپنے آبائی در و بام سے بچھڑ جانے کا دکھ آخری سانس تک اُن کے حافظے میں تازہ رہا۔ میری پیدائش چونکہ پیلی بھیت کی تھی اور میں بڑا بیٹا تھا اس لیے اُن کی خواہش رہی کہ پیلی بھیت سے جو محبت اُن کو ہے وہ مجھے بھی وراثت میں منتقل ہوجائے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پانچویں چھٹی کلاس میں تھا تو ابّا کھارادر کے فلیٹ کے سرخ فرش پر کھریا (چاک) سے پیلی بھیت کے کسی ایک محلے کا نقشہ بناتے اور مجھ کو اس محلے کے نمایاں مقامات، مکانات، گلیاں اور افراد کے بارے میں سمجھاتے تھے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ جب اُن کو فرصت ملتی وہ اس عمل کو دہراتے۔ اس دوران یادوں کی اثر انگیزی اکثر اُن پر گریہ طاری کردیتی اور میں بھی رونے لگتا۔ شاید اُن کے اسی طرزِ عمل کی بنا پر پیلی بھیت سے محبت میری روح میں بھی جاگزیں ہوگئی اور میں دو سال کی عمر میں کراچی آجانے کے باوجود ابھی تک خود کو پیلی بھیت کی یاد سے علیحدہ نہیں کرپاتا ہوں۔ یہی نہیں ابّا نے اس طرح پیلی بھیت کا نقشہ میرے ذہن پر مرتسم کردیا تھا کہ میں اکتوبر ۱۹۷۹ء میں جب پہلی مرتبہ بذریعہ بس بریلی سے پیلی بھیت پہنچا تو مجھے خیال آیا کہ امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر میں استنجا نہیں کرسکا تھا اس لیے نجس حالت میں ہوں۔ بس اسٹینڈ سے سائیکل رکشہ

کے ذریعہ اپنے عم زاد معین احمد صوفی کے گھر واقع محلہ محمد واصل جانے کے لیے کچہری روڈ اور بیلوں والے چوک سے گزرنا ناگزیر تھا اور اسی سڑک پر میرے پردادا حضرت محدث سورتی علیہ رحمۃ کا مزار و مقبرہ، بیلوں والی مسجد اور ہمارا آبائی قبرستان پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا اِن مقدس عمارات پر نجس حالت میں میری نگاہ پڑے گی۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے معین احمد سے کہا کہ کسی ایسی جانب سے اپنے گھر لے چلو کہ مذکورہ مقدس عمارات نظر نہ آئیں۔ معین احمد سوچ میں پڑ گئے اور میرا حافظہ تازہ ہوگیا۔ میں نے ایک لمحہ توقف کے بعد اُن سے کہا رکشہ میں بیٹھیں میں بتاتا جاؤں گا کہ کہاں کہاں سے گزرنا ہے۔ معین احمد مسکرائے اور بولے آپ کو کیا معلوم۔ میں نے جواباً عرض کیا چلو یہ بھی بتادیتے ہیں۔ میں نے رکشہ والے سے شاہ جی محمد شیر میاں علیہ رحمہ کے مزار کی طرف چلنے کو کہا اور چند گلیوں کے بعد اُس موڑ پر آگیا جہاں سے ایک راستہ محلّہ خدا گنج کی طرف جاتا ہے اور دوسرا معمولی سے خم کے ساتھ محلّہ محمد واصل کو پہنچتا ہے۔ اس عرصہ میں معین احمد خاموش بیٹھے رہے اور میں نے ایک چڑھائی پر رکشہ والے کو ڈال کر ایک دروازے پر اُسے روک دیا اور کہا یہ لو محمد طاہر چچا کا گھر آگیا۔ معین احمد ورطۂ حیرت میں پڑ گئے۔ وہ کہنے لگے آپ کو یہ سب کیسے پتہ ہے۔ میں نے کہا کہ اندر چلو پھر سب بتادوں گا۔ ایسے میں دروازہ کھلا اور اپنے خد و خال سے مماثلت رکھتے ہوئے چہروں پر نگاہ کیا پڑی کہ آنکھوں نے ضبط کا دامن چھوڑ دیا اور پوری گلی آہوں اور سسکیوں سے گونجنے لگی۔

ابّا کے انتقال کے بعد جب میں نے اُن کے کاغذات اور ڈائریاں دیکھیں تو مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے نہ صرف پیلی بھیت سے آنے والے خطوط کا ایک علیحدہ فائل بنایا ہوا تھا بلکہ ایک ڈائری میں ہر شعبہ زندگی میں

پیلی بھیت کے معروف، نامور اور سرکردہ افراد کے نام معہ شعبہ جات درج کرر کھے تھے۔ ان افراد میں علماء کرام، حکیم و طبیب، مفتی و حفاظ، پیرانِ طریقت، آئمہ مساجد، صوفی اور فقرا، رؤسا و زمیندار، وکلا و محرّر، میلا دخواں، عرضی نویس، عطّار و دوا فروش، قوال، جرّاح، معمار و مستری، تانگے والے، جلد ساز، حلوائی، نانبائی، بھٹیارے، قصّاب، حجام و درزی، بھشتی، اُچکے چور، اعلان کرنے والے، وضع دار بدمعاش، افیونی، شرابی، شطرنج و تاش کے کھلاڑی، پتنگ باز و پتنگ ساز، ٹینس کے کھلاڑی، کاتب، چمڑے اور جنگلات کے کاروباری، گھڑی ساز، اخبار و رسائل، صحافی و شاعر، بھٹے والے، شکاری، پہلوان، گلی ڈنڈے کے کھلاڑی، سنیما، مشہور تعزیے، دریا، جنگلات، مشہور مساجد، حمام و مسافر خانے، مشہور کنویں، پن چکی، مشہور عرس، مشہور مزارات، مشہور اشیاء، حکام و منصف سے لیکر جوتا ساز اور رسی بٹنے والوں کے نام بھی شامل ہیں۔ اس فہرست میں ابّا نے اپنا اور اپنے بھائی فضل احمد صوفی کا نام گلی ڈنڈے کے کھلاڑیوں اور پتنگ بازوں میں درج کیا ہے جبکہ اپنے بڑے بھائی شاہ مانا میاں قادری کو فقرا اور مجاذیب کے ضمن میں رکھا ہے۔ ان تفصیلات کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پیلی بھیت سے میرا تعلق برقرار رکھنے کے لیے ابّا نے یہ تمام عملی اقدامات کیے تھے۔ اپنی یادیں وراثت میں مجھ کو منتقل کرنے کے اس عمل نے جہاں ابّا سے عشق کی حد تک میرے تعلق کو مہمیز کیا وہاں مجھے آمادہ کیا کہ میں پیلی بھیت کے حوالے سے مزید معلومات اور تفصیلات کو جمع کروں۔ پھر جب میں نے اپنے پردادا کی سوانح ''تذکرۂ محدث سورتی'' لکھنے کا ارادہ کیا تو انہی تفصیلات و معلومات نے میرے کام کو بہت آسان کردیا۔ ابّا کراچی کے ایک مذہبی ماہنامہ رسالے ''پیامِ حق'' کے تقریباً ۲۳ سال مدیر رہے۔ اس رسالے میں بھی انہوں نے

حافظ رحمت خاں روہیلہ کے حوالے سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس میں پیلی بھیت کی آبادکاری اور تعمیر و ترقی کے ضمن میں حافظ رحمت خاں روہیلہ اور اُن کے عمال کی کارگزاریوں کو واضح طور پر درج کیا۔ ابّا کی شاید ہی کوئی کتاب یا مضمون ایسا ہو جس میں انہوں نے پیلی بھیت کو نظر انداز کیا ہو۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے عرض کیا کہ'' آپ کو جب پیلی بھیت سے اتنی محبت ہے تو ایک مرتبہ چلے جائیں شاید کچھ صبر آجائے''۔ میری بات سن کر اُن کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ فرمانے لگے صبر تو کیا آئے گا پاگل ہوجاؤں گا۔ ہر دیوار اور دروازہ مجھے آواز دے گا۔ ہر گلی اور ہر محلّہ میرے قدم پکڑلے گا۔ ہر شخص گریہ و زاری کرے گا۔ مقابر میری بے وفائی پر طعنہ زن ہوں گے اور میں اپنی آبائی دہلیز کی دھول سر پر ڈالوں گا کہ اسی دہلیز پر میرے بزرگوں نے اپنے قدم رکھے تھے اور اسی دہلیز نے مجھے بچپن سے جوانی تک دیکھا تھا۔ میں کیسے پیلی بھیت جاسکتا ہوں۔ میں تو واقعی پاگل ہوجاؤں گا۔ ہاں ایک خواہش ہے کہ اگر آبائی قبرستان کی مٹی مل جائے تو اُسے میری قبر کی مٹی میں ضرور شامل کردینا''۔ اُس لمحہ میں ابّا کی گفتگو سن کر بہت دلگیر ہوا تھا مگر جب پیلی بھیت گیا تو آبائی قبرستان اور حضرت محدث سورتی علیہ رحمۃ کے مقبرے کی خاک لیکر کراچی واپس آیا اور اُسے ابّا کی قبر پر ڈال دیا کہ شاید اسی طرح اُن کی خواہش اور میرا وعدہ پورا ہوجائے۔ اس مرحلہ پر مجھے پیلی بھیت کے ہی ایک شاعر محمد ایوب پیام کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو پیلی بھیت سے نقل مکانی کرکے کراچی آگئے تھے اور ابّا کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔ شعر پڑھیے

اس مٹی کا کس مٹی سے رشتہ ہے معلوم تو ہو
کتبے پر یہ بات بھی لکھیے لوگ کہاں سے آئے تھے

یہاں مجھے ایک واقعہ بھی یاد آ رہا ہے جس سے ابّا کے پیلی بھیت سے تعلق اور احساسِ مجبوری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ کھارادر کے فلیٹ کی گیلری میں ایک شب چاندنی کا ایک ٹکڑا آ گیا۔ چاندنی کو دیکھ کر ابّا بے چین ہوگئے۔ اُن کو اپنے آبائی گھر کا صحن یاد آیا جو چاندنی سے بھر جایا کرتا تھا۔ ابّا گیلری میں گئے اور چاندنی کے اُس ٹکڑے میں اپنے وجود کو سمیٹ کر بیٹھ گئے۔ اس دوران اُن کی بے چینی دیدنی تھی۔ پھر وہ رونے لگے اور اس قدر روئے کہ گھر کے تمام افراد ابّا کی اصل کیفیت کا فہم نہ رکھتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ گریہ کرنے لگے۔ پیلی بھیت کی یادیں تمام عمر ابّا کا تعاقب کرتی رہیں اور وہ تمام عمر آہ و بکا کرتے رہے۔

مرحومین سے محبت

ابّا اکثر ہم سب بہن بھائیوں کو بٹھا کر اپنے خاندانی بزرگوں، اپنے رشتے داروں اور اُن افراد کا تذکرہ کیا کرتے تھے جن کا ہمارے گھرانے سے قریبی اور گہرا تعلق تھا۔ وہ کہتے تھے اپنے بزرگوں، رشتہ داروں، اور قدیم پڑوسیوں کا تذکرہ کرنا بھی صلۂ رحمی ہے۔ اُن کو یاد کرنا اور اُن کی مغفرت کی دعا کرنا داخلِ ثواب ہے۔ شاید اسی خیال سے انہوں نے اپنے بزرگوں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے انتقال کی تاریخیں ایک کاغذ پر لکھ کر ہمارے گھر کے ایک دروازہ پر یہ کاغذ چسپاں کر دیا تھا اور ہمیں تاکید کر رکھی تھی کہ جس دن جس کی تاریخِ وصال ہو تو اُس کی مغفرت کے لیے دعا کیا کرو۔ وہ کہتے تھے کہ ضروری نہیں کہ تم کوئی لمبی سورت یا سپارہ پڑھ کر مرحوم کو بخشو۔ ایک چھوٹی سی سورۃ بھی پڑھ لینا کافی ہوتا ہے مگر پڑھو خشوع و خضوع کے ساتھ تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے عمل سے خوش ہوکر مرحومین کے ساتھ رحم کا معاملہ

فرمائے۔ اپنے دادا، دادی، والد اور والدہ کے یوم وصال پر گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرتے اور نہایت گریہ ناک انداز میں دعا فرماتے۔ عموماً جس کا یومِ وصال ہوتا اُس کے طرزِ زندگی، اندازِ فکر اور اندازِ محبت و شفقت کے حوالے سے نہایت دلنشین انداز میں گفتگو فرماتے۔ شاید وہ ایسا اس لیے کیا کرتے تھے کہ اپنے بزرگوں سے ہمارے اندر روحانی تعلق وسعت پا سکے۔ کسی کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے کہتے وہ اللہ کی رحمت میں پہنچ گئے۔ اُن کی قبر نور سے بھر گئی۔ وہ داخلِ جنت ہوگئے۔ ہماری والدہ بھی مرحومین کے نام کے ساتھ ’’اللہ بخشے‘‘ کا اضافہ فرماتی تھیں، چنانچہ بچپن میں ہم اللہ بخشے کو نام کا حصہ تصور کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے بچپن میں کسی زندہ شخص کے نام کے ساتھ اللہ بخشے کہہ دیا۔ ابّا سمجھ گئے انہوں نے فوری طور پر سمجھایا کہ یہ لفظ عموماً مرحومین کے نام کے ساتھ دعائیہ طور پر لگاتے ہیں۔

دین سے محبت

دین اسلام کے حوالے سے ابّا ہمہ وقت غور و فکر کرتے رہتے تھے اور دین کی مقتضیات کے بارے میں ایسے عام فہم نکتے پیدا کرتے تھے جس سے عمومی زندگی میں دین کی ضرورت و اہمیت واضح ہوتی تھی۔ خصوصاً قرآن حکیم اور احادیث نبوی ﷺ کی تعلیمات کی تشریح اس انداز میں کرتے کہ غفلت اور بے راہ روی کا سدباب ہوتا اور ایک مسلمان کو اپنے مسلمان ہونے کے فوائد اور تقاضوں سے آگہی حاصل ہوتی۔ ابّا دین کو عوام کی اخلاقی، روحانی اور سماجی ترقی و فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، لہٰذا اپنی تحریروں میں بھی اور اپنی تقریروں میں بھی اُن ہی مسائل پر روشنی ڈالتے تھے جو عوام کی اصلاح و تربیت میں معاون ثابت ہوں۔ تردید اور تنقید سے اُن کو

بڑی اُلجھن ہوتی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ اختلاف و افتراق دین سے دُوری اور غیرضروری مباحث کا سبب بنتے ہیں۔ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنا ہی دین کا اصل راستہ ہے۔ جو لوگ فروعی معاملات کو عام کرتے ہیں اور اُن پر اصرار کرتے ہیں وہ دین کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ دین میں جبر نہیں ہے۔ دین نرمی اور انسان دوستی کی اساس ہے۔ کوئی ایسا شخص جو اپنے رویہ میں نرمی اور انسان دوستی سے عاری ہو دین کا نمائندہ نہیں کہلایا جاسکتا۔ ابّا فرصت کے اوقات میں عموماً بچوں سے گفتگو کرتے تھے اور ایسے واقعات سناتے تھے جن سے بچوں کی اخلاقی تربیت ہوسکے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کسی بزرگ کا واقعہ سنایا اور کہا کہ وہ بزرگ ہر شخص کو راضی رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ اگر بندوں کو راضی نہ کرسکا تو اپنے اللہ کو کیسے راضی کروں گا''۔
عموماً ایسے واقعات سناتے ہوئے ابّا پر رقت طاری ہوجاتی تھی۔

ازدواجی تعلقات کی پائیداری:

ازدواجی تعلقات کی خوشگواری اور استحکام کے بارے میں بھی ابّا نہ صرف اپنی بیٹیوں سے بلکہ مطب میں آئی ہوئی خواتین سے بھی عموماً گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ زن و شوہر کا رشتہ اعتماد، یقین اور افہام وتفہیم سے تقویت پاتا ہے۔ بے اعتمادی اور بدگمانی اس رشتہ کے لیے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ قناعت بہت ضروری ہے۔ اپنے وسائل کی حدود میں رہتے ہوئے خواہشات کی تکمیل جہاں تنگ دستی سے محفوظ رکھتی ہے وہاں بیوی اور شوہر کے درمیان اختلافات کو بھی راہ پانے نہیں دیتی۔ بیوی اور شوہر کو ایک دوسرے کی حدود اور اختیارات کو پہچاننا

چاہیے۔ اس رشتہ میں انانیت کا کوئی وجود نہیں ہوتا کیونکہ شخصی انا تعلقات کے درمیان دیواریں اٹھاتی ہے۔ یہ رشتہ خالصتاً باہمی احترام اور درگزر کا رشتہ ہے۔ اگر یہ رشتہ پائیدار اور خوشگوار ہوگا تو اولاد کی تربیت بھی بہتر خطوط پر ممکن ہوسکے گی۔ جن گھرانوں میں طلاق ہوجاتی ہے اُن میں اولادوں کے مزاج پیچیدہ، انانیت زدہ اور دوسروں کے لیے باعثِ آزار ہوجاتے ہیں۔ گویا طلاق کے نتیجے میں ایک زندگی متاثر نہیں ہوتی ہے بلکہ کئی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے صحافی دوست حسن عسکری فاطمی نے جو اکثر ابّا سے مختلف حوالوں سے گفتگو کرتے رہتے تھے پوچھا کہ ''مولانا طلاق کا اصل سبب کیا ہے'' ابّا چونکہ فاطمی کی خوش طبعی سے واقف تھے لہٰذا مسکراتے ہوئے ازراہِ تفنّن اُن سے کہا کہ ''فاطمی صاحب۔ ویسے تو طلاق کا اصل سبب شادی ہے لیکن اس کے دیگر اسباب بھی ہوتے ہیں اور ان اسباب میں سب سے بڑا سبب دین سے دوری ہے۔ اسلام نے میاں بیوی کے حقوق و فرائض واضح کردیئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ازدواج مطہرات سے سلوک، صحابۂ کرام کی سیرت، بزرگانِ دین کی زندگیاں سب اس رشتہ کی حرمت اور اہمیت پر دلیل ہیں۔ اگر ہم ان مقدس و محترم افراد کی ازدواجی زندگیوں سے واقفیت پیدا کرلیں تو طلاق کی کبھی نوبت نہ آئے''۔

نظامِ تعلیم:

میرے والد نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں درس و تدریس کا سلسلہ قدیم سے جاری تھا۔ لق و دق مکان کے احاطے کے اندر ہی رہائشی مکانات، مسجد، مدرسہ، بیرونی طلبہ کے لیے رہائشی کمرے اور خاندانی قبرستان موجود تھا لہٰذا مذہب اور علم سے دلچسپی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ خصوصاً حضرت محدث سورتی علیہ رحمہ کے قائم

کردہ ''مدرسۃ الحدیث'' کی وجہ سے دین کے طالب علموں اور علماء و مدرسین کی آمد و رفت رہتی تھی۔ وعظ و تقریر کا سلسلہ بھی رہا کرتا تھا۔ ایسے ماحول میں تربیت پانے کی وجہ سے ابّا میں تعلیم کے ساتھ وعظ و تقریر اور لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا اور وہ تمام عمر اپنے اس ذوق کی ہمرہی میں زندہ رہے۔ اصولِ تعلیم سے بھی واقفیت تھی چنانچہ جہاں پیلی بھیت اور کراچی میں تدریس کا فریضہ انجام دیا وہاں نظام تعلیم پر بھی ہمیشہ غور و فکر کیا۔ ۱۹۶۵ء میں اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''آج اساتذہ اور طلبہ کے درمیان آئے دن جو جھگڑے اور مناقشات ہوتے رہتے ہیں۔ امتحان کا بائیکاٹ، اسکولوں سے غیر حاضری، اساتذہ کے خلاف جلوس اور نعرے، استادوں سے بدتمیزی، گستاخی بلکہ ہاتھا پائی اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچوں کو گھر میں وہ اخلاقیات سکھائی نہیں جاتی ہیں جو اُن کو ایک مہذب طالب علم بنا سکیں۔ بچوں کے ذہن مذہبی تعلیم سے خالی ہوتے ہیں۔ اُن کو استاد کے مرتبے کا علم ہی نہیں ہوتا۔ استاد کسے کہتے ہیں، اُس کا کیا حق ہوتا ہے اور اُس کا ادب کس طرح کیا جاتا ہے یہ بات اُن کو معلوم ہی نہیں ہوتی ہے۔ مذہب کے زیر اثر تعلیم کی پہلی اور بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ بچوں میں جذبۂ اطاعت پیدا کرتا ہے۔ دورانِ تعلیم بار بار اللہ کا نام آنے سے دل و دماغ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے اور بچہ ایک عظیم قوت کی موجودگی کو شروع سے ہی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اُس کے اندر اللہ کا خوف پیدا ہوتا ہے اور وہ جو کچھ پڑھ رہا ہوتا ہے اُسے اللہ کی رضا کے لیے پڑھتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے پہلے زمانے میں بچوں کی بسم اللہ ''قاعدہ بغدادی'' سے ہوا کرتی تھی اور وہ جب تک قرآن حکیم کا ناظرہ مکمل نہیں کرلیتا تھا اُسے کسی اور سمت لگایا نہیں جاتا تھا۔ بچے کا یہی دور اُس کے کردار کی تشکیل کا اساسی دور ہوتا تھا''۔

''انگریزوں کے عطا کردہ نظام تعلیم نے ہم کو روزگار کے مواقع تو فراہم کردیئے لیکن ہماری تہذیبی روایات جو مذہب سے جڑی ہوئی تھیں ہم سے چھین لیں۔ قدیم مدارس میں استاد کی اطاعت، عزت و احترام اور اُس سے محبت کی وجہ صرف یہی تھی کہ اُن کی تعلیم مذہبی خطوط پر ہوتی تھی اور وہ حصولِ علم کو عبادت تصور کرتے تھے۔ آپ تعجب کریں گے کہ استاد اور کتاب کا ادب تو بعد کی بات ہے ہم سے تو یہاں تک کہا جاتا تھا کہ مدرسے آتے اور جاتے وقت یا اس کے علاوہ کہیں بھی کوئی کاغذ گرا پڑا نظر آئے تو اُسے اٹھا کر کسی اونچی جگہ اُڑس دو۔ کاغذ پر لکھا جاتا ہے اس لیے احترام ضروری ہے۔ ہم کو یہ بھی ہدایت کی جاتی تھی کہ سینٹھے (نرکُل) کے قلم کو استاد سے بنواؤ یا خود بناؤ تو اُسکی چھیلن کو اُٹھا کر کسی ایک طرف زمین میں دبا دو کیونکہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم کھائی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا تھا کہ جب تختی دھو تو ایسی جگہ بیٹھ کر دھویا کرو کہ جہاں اُس کا پانی پیروں کے نیچے نہ آئے۔ میرے نانا شاہ عبدالکریم گنج مراد آبادی علیہ رحمہ نے گھر کے ایک کونے میں مٹی کا ایک بڑا سا برتن رکھ دیا تھا جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ سب کو سخت تاکید تھی کہ کہیں کوئی کاغذ پڑا ملے تو اُسے اٹھا کر اس برتن میں ڈال دیا کرو۔ کچھ دن کے بعد کاغذ برتن میں گل جاتے تھے تو گھر کی خواتین ان گلے ہوئے کاغذوں سے ڈلیا بنا لیا کرتی تھیں جو کسی چیز کو رکھنے کے کام آتی تھیں۔ میری نانی ان ڈلیوں میں چھالیا کتر کے رکھا کرتی تھیں''۔

ابّا نے مزید لکھا ہے کہ ''میں دیکھتا ہوں کہ آج بھی اس گئے گزرے دور میں جو اسلامی یا دینی مدارس ہیں اُن پر نظر ڈالی جائے تو بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ جدید اسکولوں سے کہیں زیادہ ادب و سکوں یہاں موجود ہے جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ

یہاں دینی اقدار کردار و ذہن کا حصہ بنادی جاتی ہیں۔ اس نظام میں بچے تو بچے وہ نوجوان جو درسِ نظامی پڑھنے میں مشغول ہوتے ہیں اُن کو بھی استاد کے عدم احترام اور کسی قسم کے احتجاج کا خیال نہیں آتا حالانکہ وہ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کے مقابلے میں غریب اور نادار ہوتے ہیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ مفلسی اور ناداری بدعنوانیوں اور جرائم کو جنم دیتی ہے۔ ایسے لوگ سرکشی اور بغاوت پر جلد اُتر آتے ہیں مگر مذہبی مدارس کے طالب علموں میں ایسی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ یہ صرف اسلامی تعلیم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دراصل بچوں کی تعلیم و تربیت کا تعلق ماں باپ اور استاد سے ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کسی بچے کو یہ دونوں معلم زیورِ اخلاق وعمل سے آراستہ مل جائیں اور شروع سے ہی بچے کے ذہن میں اسلامی عقائد و اخلاق کو جاگزیں کردیں تو ممکن ہی نہیں کہ بچے کا ذہن فساد اور برائی کی طرف مائل ہو۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز ہے جو بچوں کے ذہن کی تربیت میں الفاظ و نصیحت سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے، اور وہ ماحول ہے۔ جن بچوں کو نصیحت کے ساتھ ساتھ اس قسم کے مثبت ماحول کو دیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے، وہ صرف خیال کی حد تک نیک نہیں ہوتے ہیں بلکہ عملی طور پر بھی ان کی زندگی دوسرے بچوں اور والدین کے لیے نمونہ ہوتی ہے"۔

آغازِ تعلیم

ابّا نے اپنی ذاتی ڈائریوں میں بھی اور اپنی نامکمل خودنوشت "قاری کی کہانی، قاری کے قلم سے" میں بھی اپنے والدین کی تربیت کے انداز اور اپنے اساتذہ کے شفقت آمیز رویوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ انہوں نے اپنے ایک ابتدائی استاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مولانا حسن الدین چاٹگامی پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں

نازل فرمائے۔ مرحوم نے بڑی محبت، شفقت اور توجہ سے مجھے "قاعدہ بغدادی" سے لیکر قرآنِ کریم کے آخری پارے تک ایک ایک سطر اس طرح پڑھائی کہ پھر کبھی بھولنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ مشرقی بنگال چاٹ گام کے رہنے والے تھے اور دورۂ حدیث کرنے مدرسۃ الحدیث پیلی بھیت آئے تھے۔ ابتدائی طور پر حضرت محدث سورتی علیہ رحمہ سے کچھ کتابیں پڑھیں بعد میں میرے والد مولانا عبدالاحد قادری اور میرے چچا مولانا عبدالحئی قادری سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ مولانا سلامت اللہ خاں رامپوری کے ہاتھوں دستار بندی کی رسم ادا ہوئی۔ استاد کی محبت کے ایسے اسیر ہوئے کہ پھر لوٹ کر گھر نہیں گئے اور حضرت محدث سورتی کے مقبرہ سے متصل ایک حجرہ میں عمر گزار دی۔ وہ بعد نمازِ فجر دورۂ حدیث میں شریک ہوتے تھے اور ظہر بعد محلے کے بچوں کو مسجد میں قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ نہایت خوش الحان تھے لہٰذا والد کے حکم پر اذان بھی وہی دیا کرتے تھے۔ وہ جتنی دیر اذان دیا کرتے تھے راہگیر اور گھروں میں عورتیں کام چھوڑ کر نہایت مؤدب ہوکر اذان سنا کرتے۔ خصوصاً فجر کی اذان تو ایک سماں باندھ دیا کرتی تھی۔ دادی محترمہ اور والدۂ محترمہ اذان سے قبل ہی بچوں کو خاموش کرنے لگتی تھیں اور کہتی تھیں، ارے چپ ہوجاؤ حسن الدین اذان دینے والے ہوں گے، میرا اگرچہ بچپن تھا مگر اُن کی اذان کا یہ حسن و اعجاز تھا کہ کان آج تک ویسی اذان سننے کے مشتاق ہیں۔ مولوی حسن الدین ایک مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے گئے اور ایک سال بعد پیلی بھیت واپس آئے مگر اس طرح کہ پہلے سے کوئی اطلاع نہیں کی۔ رات گئے آئے اور صبح کو جب فجر کی اذان دی تو لوگ یہ کہتے ہوئے مسجد کی طرف دوڑے کہ مولوی صاحب آگئے ہیں۔ چند سال زندہ رہے اور جب میں طب کی تعلیم حاصل کرنے دہلی گیا ہوا تھا اُن کا انتقال

ہوگیا۔ میں مرحوم کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ آج قرآن کریم سے جو اُنس و لگاؤ ہے وہ
انہی کی کوششوں کا ثمر ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے''۔

''مدرسۃ الحدیث میں حساب، اُردو اور فارسی کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ حضرت
محدث سورتی کے بڑے داماد مولوی منشی عبدالوحید خان اُردو اور حساب پڑھاتے تھے
جبکہ حافظ محمد حیات فارسی کے استاد تھے میں نے بھی انہی دونوں مرحومین سے اُردو،
حساب اور فارسی پڑھی۔ ''آمدن نامے'' سے میری طبیعت بھاگتی تھی مگر
''گلزارِ دبستاں'' پڑھنے میں دل لگتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سے جدید نصاب
تیار کرلیے جائیں مگر ''قاعدہ بغدادی'' اور ''آمدن نامہ'' کا جواب نہیں ہوسکتا۔ اِن
دو کتابوں کے دلجمعی کے ساتھ مطالعے نے لاکھوں افراد پر علم سے رغبت کے
دروازے کھولے اور وہ عالم فاضل کی مسند پر فائز ہوئے''۔

تعلیم سے بے رغبتی

ابّا نے پیلی بھیت کے علاوہ مدرسۂ عالیہ رامپور، مدرسۂ گذری امروہہ،
گولڑہ شریف پنڈی اور مدرسۂ امینیہ دہلی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے اپنی
ڈائری میں لکھا ہے کہ ''قرآن کریم، اُردو، فارسی اور حساب کی تعلیم مکمل ہونے کے
بعد والد مرحوم نے خاندانی روایت کے مطابق درس نظامی کی طرف ڈال دیا۔
''میزان منشعب'' سے ابتدا ہوئی۔ مدرسۃ الحدیث میں درسیات پڑھانے کے لیے
دو ماہرین مولانا عبدالحق کرگھنوی اور مولوی حبیب الرحمان پیلی بھیتی مدرس تھے۔ پانچ
برس تک دونوں استادوں نے برابر کوشش کی لیکن تعلیم میں دل لگتا ہی نہیں تھا۔
استادوں نے سر پر ہاتھ بھی پھیرا، محبت و شفقت کا رویہ بھی اپنایا، خوف بھی دلایا مگر

ہم ''پنج گنج'' اور ''نحومیر'' سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ''صرفِ کبیر'' اور ''صرفِ صغیر''
روز یاد کرتے اور بھول جاتے تھے۔ ''نحومیر'' کے قواعد تو سمجھ میں آجاتے تھے لیکن
گردان سے گردن چھڑانے کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی۔ ابتدائی استاد جو بھی ملے
بڑے مہربان اور شفیق ملے۔ مدرسہ کے اوقات کے علاوہ بھی کافی توجہ دیتے۔ حضرت
محدث سورتی کا نبیرہ تصور کرتے ہوئے قطعی سختی سے پیش نہیں آتے تھے۔ کہتے تھے
تم ہمارے استاد زادے ہو تم کو پڑھانا ہماری ذمہ داری بھی ہے اور سعادت بھی۔
والد مرحوم بھی نگرانی اور نصیحت کیا کرتے، مگر ان تمام کوششوں کے باوجود ہمیشہ
پڑھائی کی جانب سے دھیان منتشر ہی رہا''۔

''اُسی زمانے میں رامپور کے ایک مشہور بزرگ خواجہ احمد اخوند جو والد مرحوم
کے دوست تھے، پیلی بھیت تشریف لائے اور ہمارے گھر ہی قیام کیا۔ اُن کے
سامنے جب ہماری تعلیم سے عدم دلچسپی کا تذکرہ آیا تو انہوں نے والد کو مشورہ دیا کہ
''گھر سے دور رکھو تو پڑھنے میں دل لگ جائے گا۔ رام پور بھیج دیں۔ مدرسۂ عالیہ
میں پڑھیں اور میرے گھر قیام کریں''، چنانچہ ۱۹۲۶ء میں مدرسۂ عالیہ رام پور میں
داخل کرادیا گیا۔ یہاں ہم نے مولانا افضال الحق سے کافیہ، قدوری اور نورالانوار
وغیرہ پڑھیں۔ مولانا افضال الحق نہایت پائے کے عالم اور منطق و فلسفہ میں ید طولیٰ
رکھتے تھے۔ اُن کے والد مولانا فضل الحق بھی خیر آبادی مکتبۂ فکر کے نامی گرامی عالم
تھے۔ دو سال بعد والد مرحوم کے ساتھ کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ موسیٰ سیٹھ کے مسافر
خانے میں قیام تھا۔ وہاں امروہہ کے قاضی احمد بھی مقیم تھے اور والد سے اُن کے
دیرینہ مراسم تھے۔ قاضی صاحب امروہہ میں ایک عربی مدرسہ کے مہتمم تھے جو
''مدرسۂ گذری'' کے نام سے معروف تھا۔ والد نے مجھے قاضی صاحب کے حوالے

کردیا اور ہمیں ''مدرسۂ گذری'' میں داخل کرادیا گیا۔ یہاں بھی پڑھائی میں دل نہیں لگا البتہ ایسی صحبتیں ضرور میسر آئیں جو اہل علم کی تھیں۔ معروف شاعر احسان امروہوی سے یہاں پر ہی مراسم قائم ہوئے۔ میں نے علی متقی خان کے پھاٹک میں رہائش اختیار کی۔ یہاں امروہہ کے معروف خطیب اور صوفی مولوی علی محتشم خاں بھی رہتے تھے۔ ان کی صحبت میں تقریر کرنے اور قوالی سننے کا شوق پیدا ہوا''۔

امروہہ میں قیام کے دوران ہی بریلی میں اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ رحمہ کے عرس کا اجتماع تھا۔ مولوی علی محتشم خان کی صحبت میں تقریر میں ملکہ حاصل ہوگیا تھا لہٰذا مولوی علی محتشم خان کے ساتھ ہی عرس کی تقریبات میں شرکت کی۔ رات کو علماء کے اجتماع میں زندگی کی پہلی تقریر کی۔ تقریر کے اختتام پر ایک لطیفہ ہوگیا۔ ہوا یوں کہ میری تقریر کے فوراً بعد مولانا حشمت علی خان لکھنوی کی تقریر ہونے والی تھی۔ وہ بڑے بولنے والے اور اہلسنّت کے مایہ ناز مبلغ و مناظر تھے۔ میرے منہ سے تقریر ختم کرتے ہوئے نکل گیا کہ ''اب آپ کے سامنے مشہور عالم اور واعظ مولانا حشمت علی خاں لکھنوی تشریف لا رہے ہیں۔ میں تو اُن کے سامنے مچھر کی حیثیت رکھتا ہوں''۔ مولانا نے تقریر شروع کی اور پہلی بات یہی کہی کہ ''قاری صاحب نے خود کو مچھر کہہ کر مجھے نمرود بنادیا''۔ مجمع نے قہقہہ بلند کیا اور مولانا نے خطبہ شروع کردیا اور میں خطابت کے حوالے سے اپنی ناتجربے کاری کے احساس سے نادم ہوگیا''۔

۱۹۳۰ء میں امروہہ سے واپسی پر ابّا کو اُن کے والد نے گولڑہ شریف راولپنڈی بھیج دیا۔ گولڑہ شریف میں برصغیر پاک و ہند کے نامور عالم شریعت و طریقت حضرت اعلیٰ پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی علیہ رحمہ کا فیض جاری تھا۔ ابّا نے پیر صاحب کے

بارے میں اپنے استاد مولانا افضال الحق رامپوری سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی علیہ رحمہ اور ابّا کے دادا حضرت محدث سورتی علیہ رحمہ نے سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری علیہ رحمہ سے دورۂ حدیث پڑھا تھا۔ ان دونوں بزرگوں کی متعدد بار باہم ملاقاتیں بھی رہی تھیں اس لیے مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی بھی گولڑہ شریف کی حاضری دیا کرتے تھے اور گولڑے شریف کے علمی ماحول سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے ابّا کو اگرچہ تعلیم کے حصول کے لیے گولڑہ شریف بھیجا تھا لیکن یہ تاکید بھی کردی تھی کہ اگر دل آمادہ ہو تو پیر صاحب سے بیعت بھی ہوجانا کہ اُن کا روحانی فیض عام ہے۔ ابّا نے گولڑہ شریف میں مولانا محمد غازی سے کچھ کتابیں پڑھیں اور وہاں پر ہی قاری غلام محمد سے قرأت سیکھی اور پیر مہر علی شاہ علیہ رحمۃ سے بیعت ہوئے۔ ابّا کی طب کی سند میں انہوں نے پیر مہر علی شاہ علیہ رحمۃ کی نسبت سے اپنا نام ''قاری احمد مہری'' درج کروایا تھا۔

مولانا عبدالاحد قادریؒ کا انتقال

راولپنڈی میں قیام کے دوران ہی ابّا کو معلوم ہوا کہ اُن کے والد شدید بیمار ہیں چنانچہ ایک مرتبہ پھر تعلیم ترک کرکے پیلی بھیت واپس آگئے اور خود کو والد کی خدمت پر مامور کردیا۔ اُن کے والد کو خونی بواسیر کا مرض لاحق تھا اور اس مرض نے اُن کو نہ صرف ہلکان کردیا تھا بلکہ دیگر عوارض بھی پیدا کردیئے تھے۔ آخری دنوں میں پیلی بھیت سے اپنے والد کو لیکر وہ لکھنؤ گئے۔ ایک ہفتہ ڈاکٹر حکیم عبدالعلی کا علاج جاری رہا مگر جانبر نہ ہوسکے۔ ۱۳ر شعبان ۱۳۵۲ھ کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور گنج مرادآباد میں اپنے خسر مولانا عبدالکریم گنج مرادآبادی کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔

حصولِ علم کی جانب رغبت

۱۳ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو اپنے والد کے انتقال کے بعد ابّا تعلیم کی جانب سنجیدگی سے راغب ہوئے اور وہ دہلی چلے گئے۔ اپنی ڈائری میں دہلی جانے اور وہاں از سرِ نو تعلیم شروع کرنے کے بارے میں انہوں نے جو تفصیلات درج کی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی ان کے لیے صراطِ مستقیم ثابت ہوئی۔ وہ اپنے والد کے ہمراہ پہلے دہلی آچکے تھے اس لیے اسٹیشن سے سیدھے گاندھی گراؤنڈ ہوتے ہوئے مسجد فتح پوری پہنچ گئے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اشتیاق احمد چشتی صاحب سے ملو وہ اعلیٰ اخلاق کے حامل خاندانی آدمی ہیں۔ چنانچہ چشتی صاحب سے ملاقات کی۔ اُن کو جب یہ معلوم ہوا کہ ابّا کی گنج مراد آباد سے بھی رشتہ داری ہے تو انہوں نے نہ صرف مالی تعاون کیا بلکہ دو ایک روز کے بعد ایک تعارفی خط کے ساتھ مدرسۂ امینیہ بھیج دیا جہاں مفتی کفایت اللہ شیخ الحدیث تھے۔ مفتی کفایت اللہ دیوبندی علما میں اعتدال کی راہ پر تھے لہٰذا انہوں نے حضرت محدث سورتی علیہ رحمۃ کا نام سن کر نہ صرف عزت دی بلکہ مدرسہ میں داخلہ دے دیا۔ بس یہاں سے ہی ابّا کی زندگی کا وہ رخ شروع ہوا جو ان کی آخری سانس تک تابدار رہا۔

دہلی ہی میں قیام کے دوران ابّا کو اپنے آبائی پیشے حکمت کا خیال آیا اور انہوں نے طب کی تعلیم حاصل کرنا شروع کردی۔ حکیم عبدالسلام اپنے گھر پر طبیہ کالج کا کورس پڑھایا کرتے تھے لہٰذا اُن کے پاس جانے لگے اور دو سال میں نہایت دلچسپی کے ساتھ طبیہ کالج کا کورس ختم کرکے سندِ طب حاصل کرلی۔ حکیم عبدالسلام نے تجربہ حاصل کرنے کے لیے ایک اور نامور طبیب خان بہادر حکیم سراج الدین کے

پاس بھیج دیا۔ جہاں تشخیص، طریقۂ علاج، نسخہ نویسی اور ادویہ سازی کی تربیت حاصل کی۔ کچھ عرصہ دہلی کے ایک اور نامور حکیم غلام کبریا خاں کے مطب میں نائب معالج کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس دوران درس نظامی کی تکمیل بھی ہوگئی۔

ابّا نے لکھا ہے کہ دہلی ہی میں شعر و ادب کے ذوق اور تقریر کے فن کو فروغ حاصل ہوا۔ سیاست سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ نامور صحافی مولانا مظہر الدین شیرکوٹی سے رسم و راہ پیدا ہوئی۔ وہ اخبار ''الامان'' نکالا کرتے تھے، چنانچہ مضمون نویسی کی جانب رغبت ہوئی۔ مولانا زاہد القادری اور خواجہ حسن نظامی سے بھی تعلقات استوار ہوئے۔ مولانا شوکت علی سے بھی کئی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا زاہد القادری کی صحبتوں میں مذہبی کتب کے مطالعے کا شوق ہوا۔ مولانا احمد سعید دہلوی اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں نے بولنے کا ڈھنگ سکھایا۔ خواجہ حسن نظامی کے ہفت روزہ منادی کو پڑھنے سے لکھنے اور بولنے کے ذوق میں اضافہ ہوا۔ جامع مسجد دہلی اور اس کے علاوہ منعقد ہونے والے دیگر جلسوں میں تقاریر کے مواقع بھی میسر آئے۔ بقول خود ابّا کہ ''دہلی کے قیام نے زندگی میں ایک خاص نظم اور ترقی کا جذبہ پیدا کیا۔ پرانے رسالے اور کتابیں خریدنے کا شوق بڑھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے ناول، منشی پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے افسانے پڑھے، شعرائے متقدمین کے علاوہ جدید شعراء میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، فانی بدایونی اور جوش ملیح آبادی کا مطالعہ کیا۔ رسالہ ''ساقی'' نہ صرف پڑھا بلکہ شاہد احمد دہلوی کے ہاں حاضری بھی دینا شروع کردی۔ فتح پوری لائبریری، ہارڈنگ لائبریری دہلی اور مختلف لائبریریوں سے استفادہ کیا''۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں ابّا دہلی کو خیرباد کہہ کر پیلی بھیت واپس آگئے۔

ابّا جب پیلی بھیت واپس پہنچے تو جہاں اُن کی دادی اور والدہ بہت خوش ہوئیں وہاں حضرت محدث سورتی کے شاگردوں، اہل سلسلہ اور رشتہ داروں نے بہت خوشی منائی۔ ابّا نے لکھا ہے کہ ''میرے استاد اور حضرت محدث سورتی علیہ رحمہ کے شاگرد مولانا عبدالحق کرگھنوی اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ضیافت کا اہتمام کیا اور مجھ سے تقریر کروائی جو پیلی بھیت میں میری پہلی تقریر تھی۔ اس تقریر کے انداز کو بہت پسند کیا گیا کیونکہ یہ پیشہ ور مولویوں کی تقریر سے مختلف تھی۔ چند احباب کے مشورے سے پیلی بھیت کی ایک تحصیل بیسل پور میں مطب کا آغاز کیا۔ مطب کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ مالی طور پر بھی زندگی میں بہتری آئی۔

مسلم لیگ میں شمولیت

بیسل پور دراصل پیلی بھیت سے ۲۰ میل کے فاصلے پر تھا اس لیے زیادہ وقت آنے جانے میں صرف ہوجاتا تھا اس لیے دوسال کے بعد پیلی بھیت میں گھر پر ہی مطب کا سلسلہ شروع کردیا۔ اسی دوران آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ بقول ابّا کہ ''مسلم لیگ کے جلسوں میں جانے اور تقریر کرنے کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ چند ماہ میں ہی سارے شہر میں قاری قاری کی دھوم مچ گئی۔ اُس زمانے میں پیلی بھیت میں مسلم لیگی رہنماؤں میں عظمت حسین وکیل، محمد عمر خان وکیل، فضل الرشید وکیل اور ڈاکٹر عبدالغفور نمایاں تھے۔ ان تمام افراد نے مجھ کو شہری مسلم لیگ پیلی بھیت کا صدر منتخب کرکے لیگ کے مرکزی آفس دہلی کو مطلع کردیا۔ مسلم لیگ سے وابستگی پر جہاں بہت سے مسلمان خوش ہوئے وہاں کچھ قوم پرست ناراض بھی ہوئے۔ اس کے فوراً بعد قائداعظم محمد علی جناح کی اپیل پر مسلمانوں نے

صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کے ختم ہونے پر یوم نجات منایا۔ ''یومِ نجات'' پر میں نے ایک جلوس مرتب کیا اور رات کو جلسہ سے خطاب کیا جس کی پاداش میں مجھے گرفتار کرلیا گیا اور میں ایک ہفتہ قید میں رہا۔ گرفتاری نے مقبولیت میں مزید اضافہ کردیا''۔

شادی خانہ آبادی

۳۱ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو ابّا کی شادی پیلی بھیت کے ایک سیّد خاندان کی خاتون ''سیّدہ خاتون'' سے ہوگئی۔ سیّدہ خاتون کے والد کا نام سیّد بشارت علی اور دادا کا نام سیّد نثار علی تھا۔ یہ خاندان ۱۶ ویں صدی عیسوی میں عراق سے ہندوستان آیا تھا اور بریلی کے ایک محلّہ نو محلّہ میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ یہ لوگ نسباً ''موسوی'' تھے۔ حافظ رحمت خان کے عہد حکومت میں اس خاندان کے کچھ افراد پیلی بھیت میں آباد ہوگئے۔ معروف شاعر سیّد ضامن حسین گویا جہاں آبادی اور پاکستان ایجوکیشنل سوسائٹی کے سربراہ سیّد الطاف علی بریلوی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ سیّد بشارت علی کا مکان محلّہ منیر خان میں معروف روحانی بزرگ شاہ جی محمد شیر میاں علیہ رحمہ کے مزار کے قریب تھا۔ ابّا کا نکاح حضرت محدث سورتی کے ایک شاگرد اور حضرت شاہ فضل رحماں گنج مراد آبادی کے مرید و خلیفہ مولانا فضل حق رحمانی نے حضرت محدث سورتی کے برادرِ خورد مولانا عبداللطیف سورتی کے مکان پر پڑھایا تھا۔ جب ابّا کی گرفتاری عمل میں آئی تو اَمّاں نئی نویلی دلہن تھیں، مگر انہوں نے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے خواتین کے ایک احتجاجی جلوسوں میں حصہ لیا اور کلکٹر کے آفس کے باہر دھرنا دیا۔ سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر ابّا مطب پر زیادہ توجہ نہیں دے سکے اس

لیے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی مالی مشکلات سے نکلنے کے لیے انھوں نے ۱۹۴۳ء میں پیلی بھیت کی ایک تحصیل جہاں آباد کے یونانی اسپتال میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہ ملازمت تقریباً دوسال رہی۔ اس ملازمت کو ترک کرنے کے بعد ابّا پھر سے اپنے سیاسی شب و روز میں لوٹ آئے۔ مسلم لیگ اور آل انڈیا سنی کانفرنس اُن کے پلیٹ فارم تھے اور مطالبۂ پاکستان کی منظوری اُن کا مطلوب و مقصود تھا۔

اولادیں

ابتداً ابّا کے تین بچے ہوئے ایک لڑکی اور دو لڑکے لیکن یہ سب بچے پیدائش کے فوراً بعد انتقال کرگئے۔ ۱۹۴۴ء میں پھر ایک لڑکی اشرف عرف صفیہ قاری پیدا ہوئیں اور اشرف کی پیٹھ پر میں پیدا ہوا۔ ابّا کے بڑے بھائی شاہ مانا میاں قادری نے چونکہ اجمیر میں لڑکے کی دعا مانگی تھی اس لیے مجھے خواجہ میاں کہہ کر پکارا۔ اس کے بعد زاہدہ پیدا ہوئیں۔ کراچی پہنچ کر ایک صاحبزادے مقیم احمد پیدا ہوئے اور نو ماہ بعد انتقال کرگئے۔ پھر شاہدہ، خالدہ، راشدہ، وصی حیدر اور ولی حیدر پیدا ہوئے۔

اشرف عرف صفیہ قاری نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں ایم اے تاریخ کے مضمون میں کیا۔ اُن کی شادی رامپور سے نقل مکانی کرکے حیدر آباد میں آباد ہونے والے ڈاکٹر عظیم الدین خان کے فرزند سلیم الدین خان سے ہوئی۔ ایک بیٹی عالیہ اور تین بیٹے کامران، عمران ریحان پیدا ہوئے۔ سلیم الدین خان کا انتقال ۳/اپریل ۲۰۰۱ء کو جبکہ صفیہ قاری کا انتقال ۱۴/مئی ۲۰۱۰ء کو ہوا۔

خواجہ رضی حیدر نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں ایم اے اُردو میں کیا۔ صحافت سے پیشہ ورانہ زندگی آغاز کی اور قائد اعظم اکادمی سے ڈائریکٹر کی حیثیت

سے ۲۰۰۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۷/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو ریاست ٹونک کے سیّد انوار احمد کی صاحبزادی رشیدہ بیگم سے شادی ہوئی۔ دو لڑکیاں شجیعہ، ثنیعہ اور ایک بیٹا خواجہ علی حیدر ہیں۔ سب کی شادیاں ہوچکی ہیں۔

زاہدہ قاری نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۲۰/دسمبر ۱۹۹۰ء میں سیّد احمد شاہ سے شادی ہوئی۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ۲۴/اپریل ۲۰۰۸ء کو انتقال ہوا۔

شاہدہ قاری کی تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳/نومبر ۱۹۷۳ء میں کانپور کے ثابت حسین خاں کے صاحبزادے صادق حسین سے شادی ہوئی۔ تین لڑکے مخدوم، محمود، مشہود اور دو لڑکیاں سعدیہ اور ثوبیہ ہیں۔

خالدہ قاری نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۳۰/جولائی ۱۹۸۲ء کو بنگلور کے سیّد عثمان کے صاحبزادے سیّد اکبر سے اُن کی شادی ہوئی۔ دو لڑکیاں بینش، سمیّہ اور ایک لڑکا عبدالغفار طٰحٰہ ہیں۔

راشدہ قاری نے کراچی یونیورسٹی سے میرین سائنسز میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور وہاں پر ہی تدریس سے وابستہ ہیں۔ سہسوان بدایوں کے سیّد ضامن علی نقوی کے صاحبزادے سیّد نسیم عالم نقوی سے ۱۶/جنوری ۱۹۹۲ء کو شادی ہوئی۔ دو لڑکیاں راسخہ، راحمہ اور ایک بیٹا سید منیب عالم ہیں۔

وصی حیدر عمار۔ نے آرکیٹکچر میں ڈپلومہ کیا۔ ۱۲/نومبر ۱۹۸۱ء میں ملک محمد شریف کی صاحبزادی سمینہ شریف سے شادی ہوئی۔ ایک لڑکا حمزہ بن حیدر اور ایک بیٹی یومیمہ ہیں۔

ولی حیدر ذاکر کی تعلیم سے فراغت کے بعد مرزا رضی احمد کی صاحبزادی رائیلہ

سے ۵ر اکتوبر ۱۹۹۵ء کو شادی ہوئی۔ ایک بیٹا نصر حیدر قاری اور ایک بیٹی سیدہ وردا ولی ہیں۔

پاکستان سے محبت

ابّا کی شخصیت کے تین عناصر ترکیبی تھے۔ اسلام، پاکستان اور اُردو، اپنے آبائی وطن سے شدید محبت کے باوجود انہوں نے کبھی اِن عناصر ترکیبی سے روگردانی نہیں کی۔ اسلام کی حقانیت، پاکستان کی نظریاتی سرحدوں پر ایمان اور اُردو زبان سے محبت اُن کا سرمایۂ افتخار تھا۔ وہ پاکستان کی مقامی بولیوں کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جب تک ہم مقامی زبانوں کا فہم پیدا نہیں کریں گے اُس وقت تک مقامی افراد سے ہمارا رابطہ مستحکم نہیں ہوگا۔ شاید اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے گجراتی، سندھی، پشتو، پنجابی اور بلوچی زبانوں میں اتنی شُد بُد پیدا کرلی تھی کہ عموماً وعظ و تقریر میں علاقوں کی مناسبت سے اُسی زبان میں دو چار فقرے کہہ دیا کرتے تھے جس سے سامعین بڑے محظوظ ہوتے تھے۔ ابّا نے مجھے بھی مقامی بولیوں کو سیکھنے کی ہدایت کی لیکن میں صرف میمنی زبان سیکھ سکا اور وہ بھی شاید اس لیے کہ میرا بچپن میمنوں کے درمیان گزرا۔

تحریک پاکستان گولڈ میڈل

پاکستان کے قیام کے سلسلہ میں ابّا نے جو خدمات انجام دی تھیں، وہ اگرچہ بڑی نمایاں تھیں لیکن ابّا نے کبھی ان کے صلہ کی توقع کو درخور اعتنا تصور نہیں کیا۔ وہ

فرماتے تھے کہ ایک آزاد ملک پاکستان کا حصول کیا کم صلہ ہے کہ مزید کسی توقع کا در وا کیا جائے لیکن بہت بعد میں یعنی ۲۰۰۴ء میں تحریک پاکستان ورکرز ٹرسٹ، لاہور نے مجھ سے ابّا کے سلسلہ میں معلومات حاصل کیں اور اُن کے لیے ''تحریک پاکستان گولڈ میڈل'' کا اعلان کیا جو اگست ۲۰۰۵ء میں تفویض ہوا۔

علمی تشخص کی تلاش

کراچی میں روزگار کا ذریعہ پیدا ہونے کے بعد ابّا نے اپنے علمی تشخص کی جانب توجہ دی۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک اُن کے متعدد مضامین روزنامہ ''انجام'' اور روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں شایع ہوئے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں ایک مذہبی رسالے ''الاسلام'' کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں بادامی مسجد میٹھادر میں امام و خطیب ہوئے۔ اسی دوران مولانا عبدالحامد بدایونی سے ربط و ضبط بڑھا۔ مولانا بدایونی چونکہ مولانا عبدالاحد قادری کے دوست تھے، لہٰذا انہوں نے ابّا پر خصوصی توجہ دی۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۴۹ء کو کراچی کے فریئر روڈ پر جلسۂ عید میلاد النبی ﷺ میں تقریر کی۔ سردار عبدالرب نشتر صدارت کررہے تھے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی نے اسی جلسہ کے بعد اُن کو جمعیت علماء پاکستان میں شمولیت کی دعوت دی اور مرکزی مہاجرین کمیٹی کا رکن مقرر کیا۔ ۷ر مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں لیاقت علی خاں نے قرار دادِ مقاصد پیش کی تو ابّا اس اجلاس میں بحیثیت مبصر شریک تھے۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ واپس آکر سفرنامۂ حج ''مشاہداتِ حرمین'' لکھا۔ اس سفرنامہ پر مولانا عبدالحامد بدایونی نے تقریظ لکھی۔ اسی سال ابّا کو جمعیت علماء پاکستان صوبہ سندھ کا نائب صدر مقرر کیا گیا۔ جمعیت

کے زیرِ اہتمام عید میلاد النبی ﷺ اور یوم حسینؓ کے جلسوں میں تقریر کرنے سے بطور مقرر و خطیب کے مقبول ہوئے۔ اس دوران ابّا کو علماء کے ایک حریص گروہ کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا اور انہوں نے بادامی مسجد کی امامت اور خطابت سے مستعفی ہوکر مسجد کے قریب ہی گاؤگلی میٹھا در میں ازسرنو ''سورتی دواخانہ'' کے نام سے مطب کا آغاز کیا۔ ''مشاہداتِ حرمین'' کی اشاعت کے بعد تحریر کے میدان میں بھی آپ کو مقبولیت حاصل ہوئی اور فروری ۱۹۵۵ء میں انہوں نے کراچی کے اشاعتی ادارے ''قرآن محل'' سے نکلنے والے ایک رسالہ ''پیامِ حق'' کی ادارت قبول کرلی۔ ''پیامِ حق'' میں مذہبی اور تاریخی موضوعات پر لاتعداد مضامین تحریر کیے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور تصانیفِ کثیرہ قلمبند فرمائیں۔ بادامی مسجد کے بعد ترک مسجد لی مارکیٹ اور رحمت مسجد بھیم پورہ میں بھی بحیثیت خطیب خدمات انجام دیں۔

پیلی بھیت ہاؤس

۲۸/اکتوبر ۱۹۵۷ء کو ناظم آباد میں ایک زیرِ تعمیر مکان خریدا اور اپنے آبائی شہر کی مناسبت سے اُس کا نام ''پیلی بھیت ہاؤس'' رکھا۔ اس زمانے میں آپ کے برادرِ بزرگ شاہ مانا میاں قادری چشتی پیلی بھیتی کراچی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے زیرِ تعمیر مکان میں دعائے خیر و برکت کے لیے چند دن قیام کیا۔ اگست ۱۹۵۸ء میں کھارادر کی رہائش ترک کر کے ''پیلی بھیت ہاؤس'' میں منتقل ہوگئے اور تمام زندگی اسی مکان میں مقیم رہے۔ اپریل ۲۰۱۰ء میں تقسیم وراثت کی خاطر اس مکان کو تمام اولادوں کے ایما پر فروخت کردیا گیا۔

آبائی مکان پیلی بھیت کے احاطے میں واقع ''بیلوں والی مسجد''

پیلی بھیت میں حضرت محدث سورتی کے مقبرے کا بیرونی منظر
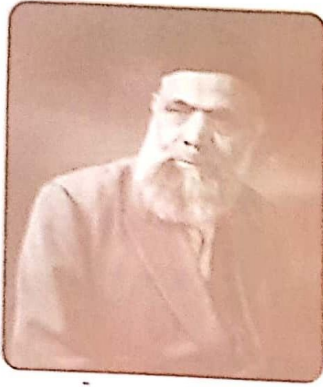
چچا مولانا عبدالمنان سورتی
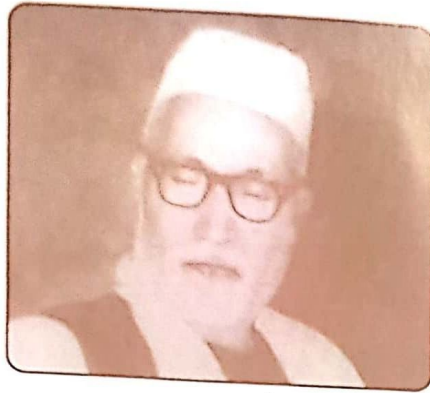
حضرت شاہ فضل الصمد مانا میاں قادری
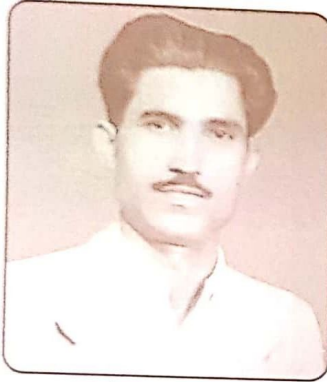
شاہ فضل احمد صوفی
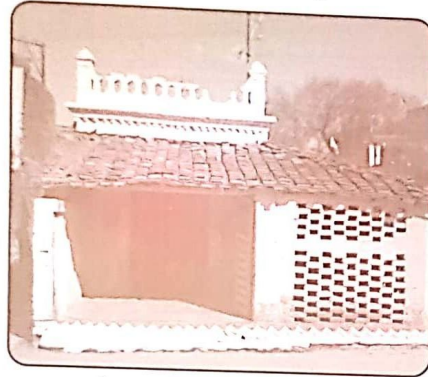
پیلی بھیت میں مانا میاں کے مقبرے کا بیرونی منظر
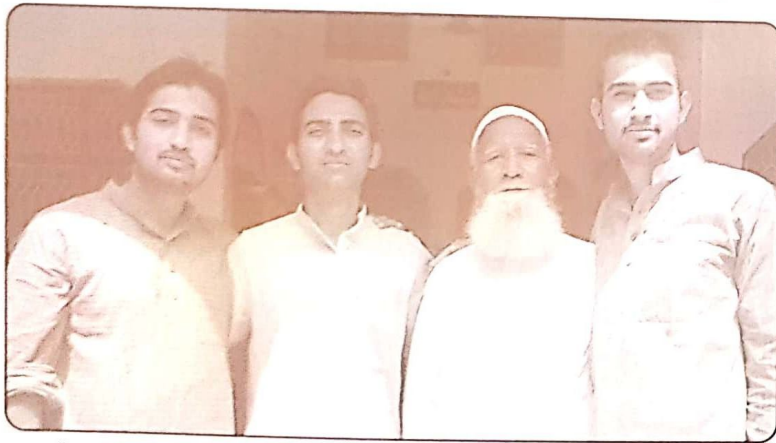
شاہ فضلِ احمد صوفی کے صاحبزادے مُعین احمد صوفی اپنے صاحبزادوں یاور اسلام سُورتی، بلال اسلام سُورتی اور بابر اسلام سُورتی کے ساتھ
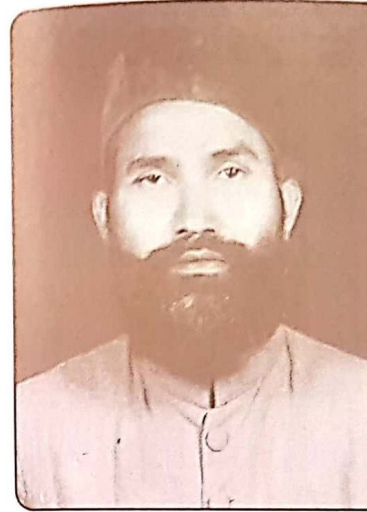
1953 میں فریضۂ حج کی ادئیگی کے لیے کھچوائی گئی تصویر
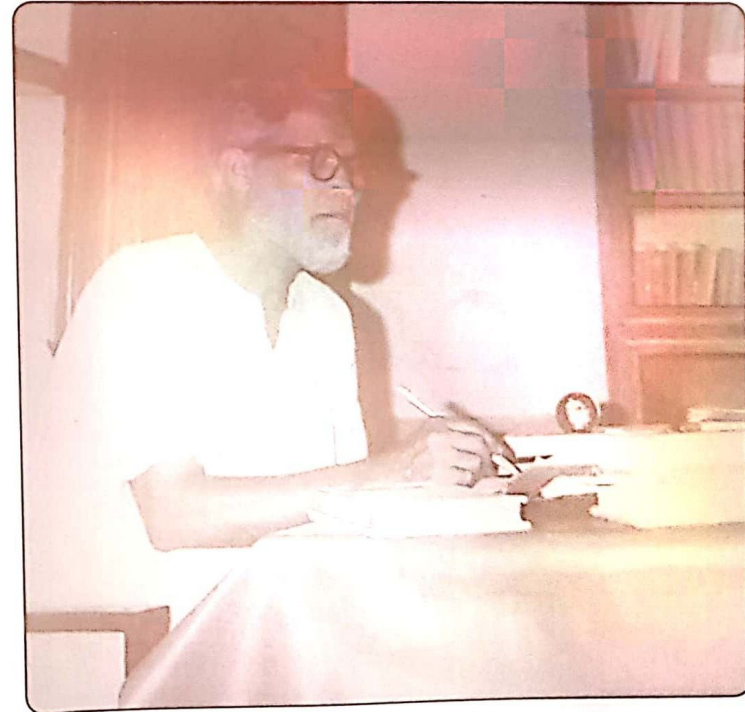
مولانا حکیم قاری احمد اپنے دارالمطالعہ میں

حضرت محدث سورتی کی صاحبزادی کریم النسا بیگم کی 1965 میں

کراچی آمد کے موقع پر مولانا حکیم قاری احمد اپنی اہلیہ، صاحبزادی صفیہ قاری، زاہدہ قاری

(بیٹھے ہوئے) شاہدہ قاری، وصی حیدر، خالدہ قاری، راشدہ قاری اور ولی حیدر کے ساتھ
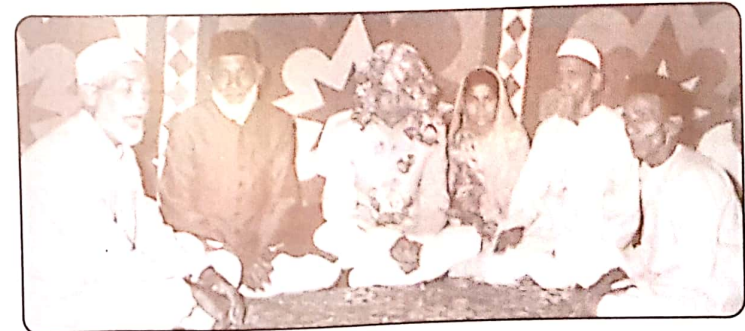
اپنی صاحبزادی شاہدہ قاری کا صادق حُسین خاں سے نکاح پڑھاتے ہوئے،

ڈولہا کے والد خان ثابت حُسین اور حلیم ماموں اور احسان ماموں کے ساتھ

کچھی مُسلم انجمن کے زیرِ اہتمام منعقدہ جلسۂ عید میلادالنبی میں محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ (1951)

کُتیانہ میمن ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام یومِ آزادی کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے،
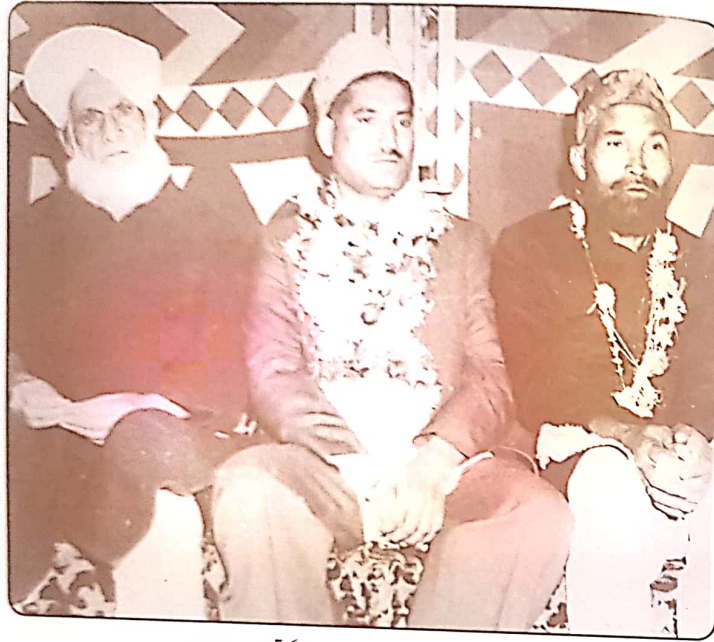
تصویر میں وزیرِ مملکت برائے دفاع سردار امیر اعظم خان نمایاں ہیں

جمعیتِ علمائے پاکستان کے زیرِ اہتمام ایرانی سفیر کے اعزاز میں استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے (1957)

سعودی سفیر عبدالحمید خطیب کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا گروپ فوٹو۔ مولانا عبدالحامد بدایونی،
مولانا حکیم قاری احمد اور نورانی میاں نمایاں ہیں

مولانا محمد علی بانٹوے والے کے صاحبزادے کی تقریب نکاح میں

THI ORDER IS NOT TRANSFERABLE

VISITOR'S CARD
PUBLIC GALLERY

No. 65

ADMIT Maulana Qari Ahmed Mehsi

to the meeting of the CONSTITUENT ASSEMBLY OF PAKISTAN to be held in the Assembly Chamber, on the 7 MAR 1949 at 11 A.M.

Issued through Mr. Secretary, M.C.A.

M. B. AHMAD,
Secretary,
Constituent Assembly of Pakistan.

H M Khan
Assistant Secretary, Constituent Assembly of Pakistan.

P. T. O.

مارچ 1949 میں قراردادِ مقاصد پیش کرنے کے لیے بلائے جانے والے دستور ساز اسمبلی کے
اجلاس میں بحیثیت مبصر شرکت کا اجازت نامہ

مہاجرین رجسٹریشن سلپ

رجسٹریشن نمبر ۲۸۳۰۷ نام حکیم قاری احمد

تاریخ

پتہ

KARACHI

پاکستان آمد کے بعد بحیثیت مہاجر رجسٹریشن کارڈ

نمبر 29352

سندِ رکنیت شہری مُسلم لیگ کراچی

تاریخ

تصدیق کی جاتی ہے کہ

باضابطہ ممبر مسلم لیگ وارڈ سے ہیں

(آفس سکریٹری پاکستان مسلم لیگ)

جون 1949 میں شہری مُسلم لیگ کی سندِ رکنیت

پاکستان مسلم لیگ

رکنیت کا کارڈ

نمبر B 630189

جناب حکیم قاری احمد صاحب/صاحبہ

ولد/بنت/زوجہ مولوی عبداللہ

ساکن حلقہ یونین نمبر ۱۰ II D. 16/5 ناظم آباد

شہر کراچی تحصیل کراچی ضلع کراچی

مغربی پاکستان سے، جنھوں نے بروز اتوار

بتاریخ ۲۷-۲-۶۶ کو پاکستان مُسلم لیگ کی رُکنیت

کے فارم پر دستخط کیے ہیں۔

مبلغ ایک روپیہ بابت فیس رکنیت برائے سال 1966 تا 70

وصول پایا۔

اندراج کرنے والے کے دستخط

مہر یا عہدہ

1966 میں پاکستان مُسلم لیگ کی رکنیت کی رسید

مُفتیِ اعظم ہند کے آستانۂ عالیہ رضویہ بریلی سے 1964 میں موصول ہونے والے ایک خط کا عکس

KUTCHI MUSLIM ANJUMAN

(GOVT. REGD.)

KARACHI

جماعت اسلامی پاکستان
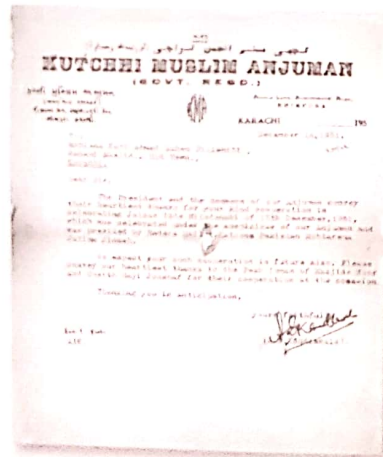
کچھی مُسلم انجمن کی جانب سے 1951 میں منعقدہ عیدِ میلادالنبی کی تقریبات میں تعاون پر اظہارِ تشکر کے خط کا عکس
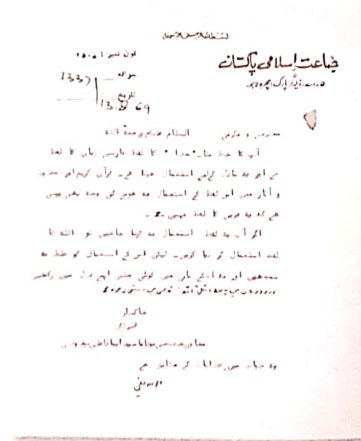
مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے 1969 میں موصول ہونے والے ایک خط کا عکس

رشتہ داروں سے تعلق

ابّا نے پوری زندگی جدوجہد میں گزاری۔ اس دوران انہوں نے جہاں اولادوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی وہاں اپنے اور امّاں کے رشتہ داروں اور عزیزوں سے بھی صلۂ رحمی کو روا رکھا۔ خصوصاً وہ اپنی خالاؤں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک خالہ صفیہ خاتون کوئٹہ میں مقیم تھیں، ایک راولپنڈی میں، ایک آگرے میں اور ایک خالہ حبیبہ خاتون کراچی میں تھیں لہٰذا کراچی میں موجود خالہ پر جان چھڑکتے تھے۔ حبیبہ خاتون جن کو ہم سب ''دادی'' کہا کرتے تھے اُن کے مزاج میں بڑا رکھ رکھاؤ اور تحمّل تھا۔ وہ ابّا کو سخت سست بھی کہہ دیا کرتی تھیں لیکن ابا ہمیشہ اُن کی خدمت پر آمادہ رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دن ضرور ان سے ملنے جاتے اور ہر مرتبہ کوئی تحفہ لے جاتے۔ خصوصاً عید الفطر کے موقع پر اُن کو چکن کا کرتہ، ململ کا پاجامہ، گرگابیاں اور عطر پیش کرتے تھے۔ مجھے خاص طور پر اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور بزرگوں کے ادب کا سلیقہ بتایا کرتے۔ بہت بعد میں ایک مرتبہ جب میں جوان ہوچکا تھا عید الفطر کے موقع پر حسب روایت مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ''وہ آپ کو سخت سست کہتی ہیں اور یہ خیال ہی نہیں کرتی ہیں کہ آپ عالم ہیں''۔ ابّا میرا یہ جملہ سن کر مسکرادیئے اور فرمانے لگے کہ ''دیکھو بیٹا میری ماں تو زندہ نہیں ہیں۔ یہ اُن کی نشانی ہیں۔ میں ان سے کسی تعظیم و تکریم کی کیسے توقع کرسکتا ہوں۔ اس عمر میں وہ جب مجھے ''قاری'' کہہ کر آواز دیتی ہیں تو میں خود کو بچہ سمجھنے لگتا ہوں۔ تم مجھے میرے بچپن سے محروم کردینا چاہتے ہو۔ تم مت جاؤ۔ میں تو جاؤں گا۔ خالہ جان کے پاس میرا بچپن ہے''۔ بعد میں وصی حیدر عمّار اور ولی حیدر

مولانا حکیم قاری احمد کے انتقال پر شاہ مانا میاں کے تعزیت نامے کا عکس

مشہور مورخ اسلام حکیم قاری احمد صاحب پیلی بھیتی کا انتقال

کراچی۔ تاخیر سے موصول ہونے والی ایک اطلاع کے مطابق حکیم قاری احمد صاحب پیلی بھیتی کا انتقال ہو گیا ہے۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون) آپ امین قریشی کے ماموں زاد بھائی تھے۔ مرحوم تاریخ اسلام کے مصنف اور متعدد مذہبی و دینی رسائل کے مدیر تھے حضرت قبلہ احمد حسن رح کانپوری سے آپ کا ننہالی سلسلہ تھا۔ کانپور کے مشہور ممبر مرحنیپلٹی مولوی عبد المنان مرحوم سے آپ کا ددھیالی سلسلہ تھا۔ آپ مشہور صوفی مولوی مانا میاں کے حقیقی برادر خورد تھے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے جناب رضی حیدر صاحب روزنامہ حریت کراچی کے سب ایڈیٹر ہیں۔ اور آپکی بڑی صاحبزادی محترمہ اشرف قاری کا شمار پاکستان کی ایک اچھی افسانہ نگار میں ہے۔ آپ کی وفات سے دینی مذہبی و ادبی دنیا میں ایک نمایاں خلا پیدا ہو گیا۔ ہماری دعا ہے کہ مرحوم کو خداوند رب العزت اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ (ادارہ)

روزنامہ سیاستِ جدید کانپور میں شائع ہونے والی انتقال کی خبر کا عکس

آگرہ (یوپی) سے پروفیسر معین فریدی کے تعزیتی خط کا عکس

SHAMA CUT PIECE CLOTH STORE
Ram Swaroop Park,
PILIBHIT.

معین احمد صوفی کے تعزیتی خط کا عکس

ذاکر کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

ابّا اپنے برادرِ بزرگ مانا میاں صاحب اور اپنے برادر زادے معین احمد صوفی کا بھی بہت خیال رکھتے تھے، اپنی پھوپھی زاد بہنوں اور خالہ زاد بہنوں سے بھی شدید محبت کرتے تھے۔ ایسا شاید اس لیے بھی تھا کہ اُن کی کوئی حقیقی بہن نہیں تھی۔ اسی طرح رشتہ کے بھائیوں کی بھی خبرگیری اُن کے معمولات میں شامل تھی۔ میرے والد کی ایک پھوپھی یعنی حضرت محدث سورتی علیہ رحمہ کی صاحبزادی کریم النساء بیگم اپنے صاحبزادوں اچھے میاں اور حسن میاں کے ساتھ رامپور میں مقیم تھی۔ اُن کو ہر دوسرے دن خط لکھ کر خیریت دریافت کرتے تھے۔ بعد میں مجھ کو یہ ذمہ داری دیدی۔ عموماً مجھ سے فرماتے ''طویل خط لکھا کرو۔ وہ بزرگ ہیں جتنی دیر تمہاری تحریر اُن کی نگاہوں میں رہے گی تم اُن کی دعاؤں میں شامل رہو گے۔ اس طرح تم کو لکھنے کی بھی عادت پڑے گی''۔ واقعی پھر مجھ کو لکھنے کی ایسی عادت ہوگئی کہ میں نہ صرف اُن کو بلکہ اُن کے صاحبزدے حسن میاں چچا کو بھی بہت مفصل اور طویل خط لکھنے لگا۔ بعد میں جب میری پیشہ ورانہ مصروفیات میں اضافہ ہوگیا تو اشرف، زاہدہ، شاہدہ، خالدہ اور راشدہ نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

نصیحت کے انداز

ابّا نے چونکہ اپنے والد کے انتقال کے بعد بہت مشکل دن دیکھے تھے اس لیے معاشی استحکام پر ہی انہوں نے توجہ نہیں دی بلکہ جُزرسی کو بھی اپنا شعار بنایا۔ روزانہ کی آمدنی اور خرچ کا باقاعدہ حساب رکھتے تھے۔ حساب کی ڈائریوں میں روزانہ کی بچت بھی درج کیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۶ء میں جب میں روزنامہ حریت میں بحیثیت سب

ایڈیٹر ملازم ہوا تو بہت خوش تھے۔ اس خوشی میں انہوں نے گھر پر خواتین کا میلاد منعقد کروایا اور گھر پر ہی حلوائی بٹھا کر موتی چور کے لڈو بنوائے جو میلاد میں تقسیم کیے گئے۔ میں نے جب اپنی پہلی تنخواہ جو تین سو تینتیس روپے تھی ابّا کو پیش کی تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں رقم لینے سے پہلے مجھ سے دریافت کیا کہ ''رضی۔ یہ بتاؤ اس گھر میں کسی چیز کی کمی ہے۔ کھانے پینے یا ساز و سامان میں''۔ میں نے جواباً عرض کیا ''نہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہے''۔ فوراً مسکرادیئے اور فرمایا کہ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر کے تمام اخراجات ہماری آمدنی سے پورے ہورہے ہیں''۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو فرمانے لگے ''گویا پھر یہ تمہاری تنخواہ اس گھر کی اضافی آمدنی ہے لہٰذا اس تنخواہ کو تمہارے نام کا ایک بینک اکاؤنٹ کھول کر جمع کرادیتے ہیں تاکہ یہ رقم تمہارے کبھی کام آسکے۔ تمہارا کپڑا لتا، کتابوں کی خریداری اور روز کا خرچ تو ہمارے ذمہ ہے ہی۔ ہاں اگر تم کو کبھی بڑی رقم کی ضرورت ہو تو اپنے اکاؤنٹ سے نکال سکتے ہو''۔ میں ابّا کی حیات میں تقریباً دس سال ملازم رہا اور جب اُن کے انتقال کے بعد ضروریات نے مجھ کو گھیرا تو میرے اکاؤنٹ میں ۴۲ ہزار روپے جمع تھے۔ یہ ابّا کی دوراندیشی تھی کہ میں اُن کے انتقال کے بعد مشکل دنوں میں استقامت کے ساتھ کھڑا رہا۔

میرے میٹرک پاس کرنے تک ابّا میری تعلیم کی جانب سے بڑے فکر مند رہا کرتے تھے کیونکہ میں پڑھنے کی جانب توجہ نہیں دیتا تھا۔ کھیل کود اور آوارگی میں دن گزرتے تھے لہٰذا وہ اپنے پاس ہر آنے والے سے میری لاپرواہی کا تذکرہ کرتے اور درخواست کرتے کہ اسے نصیحت کریں۔ ان افراد میں معروف ایڈوکیٹ آزاد بن حیدر اور ایک استاد مولوی سید حامد علی سنبھلی بھی شامل تھے جنہوں نے مجھ کو نہ صرف

کئی اسکولوں میں داخلہ دلوایا بلکہ میرے لیے ٹیوٹر کا بھی انتظام کیا۔ معروف عالم دین مفتی محمد عمر نعیمی کے پاس بھی ابّا مجھ کو عموماً ساتھ لے جایا کرتے اور میرے حق میں خصوصی دعا کرواتے۔ ابّا کی تشویش اور دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا کہ میں میٹرک کے بعد دلجمعی کے ساتھ نہ صرف تعلیم حاصل کرنے لگا بلکہ مضمون نویسی اور افسانہ نگاری کی طرف بھی مائل ہوا۔ بی اے پاس کرنے تک میرے کئی مضامین اخبارات اور رسائل میں شایع ہوچکے تھے اور مجھ میں لکھنے کی اتنی استعداد پیدا ہوچکی تھی کہ اخبار میں ملازمت مل گئی۔ ابّا کو ملازمت کی تو خوشی تھی لیکن اس بات کا افسوس تھا کہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا ہے۔ ایک دن مجھے اپنے پاس بلایا اور فرمایا ایم اے کرلو۔ سند کہیں نہ کہیں ضرور کام آتی ہے۔ میں نے ابّا کی فہمائش پر اُردو میں ایم اے کرلیا اور پندرہ سال بعد قائد اعظم اکادمی کی ملازمت میں یہی سند معاون ثابت ہوئی۔ گھر کا ماحول بھی علمی تھا۔ ابّا کی لائبریری میں نادر کتابیں موجود تھیں۔ ابّا خود بھی ہمہ وقت میز کرسی پر بیٹھے لکھتے رہتے تھے۔ پھر میری بڑی بہن صفیہ قاری (اشرف) بھی اخبارات میں خواتین کے صفحات پر لکھا کرتی تھیں اس لیے بھی میرے ذوق و شوق میں اضافہ ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ ستر کی دہائی کے شروع میں میرا ایک مضمون فلمی گلوکارہ نسیم بیگم کے انتقال پر روزنامہ حریت میں شایع ہوا۔ نسیم بیگم میری پسندیدہ گلوکارہ تھی، اس لیے میں نے یہ مضمون خوب دل لگا کر لکھا تھا۔ میرے ایک بزرگ دوست قاضی اعجاز احمد فاروقی جو نہایت علمی شخص اور افسانہ نگار تھے، شام کو اس مضمون کی تعریف کرنے گھر آئے۔ میں گھر پر موجود نہیں تھا لہٰذا اُن کی ملاقات ابّا سے ہوگئی اور انہوں نے یہ سوچے بغیر کہ ابّا ایک مذہبی آدمی ہیں اُن سے میرے مضمون کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اب رضی بہت اچھا لکھنے لگا ہے۔ بقول فاروقی صاحب، ابّا

نے یہ سن کر فاروقی صاحب سے فرمایا ''وہ کیا لکھتا ہے یہ تو آپ ہی بہتر بتا سکتے ہیں لیکن میں اُس کا باپ ہونے کی وجہ سے اس بات پر خوش ہوتا ہوں کہ اُسے اپنی جہالت کو چھپانے کا فن آگیا ہے''۔ آج اس واقعہ کو چالیس سال کا عرصہ گزرجانے کے باوجود میرے اندر یہ احساس موجزن ہے کہ واقعی میں اخفائے جہل کے لیے لکھ پڑھ رہا ہوں۔

نصیحت کرنے کا انداز بھی ابّا کا بڑا مختلف تھا۔ کالج میں پہنچنے کے بعد میں نے اپنے ایک ہم محلّہ دوست جمیل کی صحبت میں سگریٹ پینا شروع کردی۔ ہم رات کو کھانا کھانے کے بعد گھر سے دور ٹہلنے نکل جاتے اور اس دوران سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم سگریٹ پی رہے تھے کہ سامنے سے ابّا آتے ہوئے نظر آئے۔ ہم دونوں نے سگریٹ پھینک دیئے۔ وہ ہمارے قریب سے گزرے۔ ہم نے سلام کیا اور انہوں نے خیریت دریافت کی۔ نامعلوم میرے اندر اُس وقت ایک خوف جاگ گیا کہ ابّا نے مجھ کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا ہے لہٰذا میں اُس رات دیر سے گھر میں داخل ہوا اور فوراً جا کر سوگیا۔ اگلے دن رات کو ابّا گھر آئے اور معمول کے مطابق کھانا کھانے کے بعد اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر مجھے آواز دی۔ میں پہنچا تو کہنے لگے ذرا باورچی خانے سے ماچس لے آؤ۔ میں ماچس لیکر آیا تو انہوں نے میز کی دراز سے ایک سگریٹ نکالی اور اُسے منہ میں لگا کر ماچس جلائی۔ میرے لیے یہ منظر عجیب تھا لہٰذا میرے منہ سے نکل گیا ''ابّا یہ کیا''۔ ابّا نے سگریٹ منہ سے نکالی اور مجھ سے کہا ''دیکھو بیٹا ہم پان کھاتے ہیں۔ تم بھی پان کھاتے ہو، کبھی کبھی ہم دونوں ایک دوسرے کا بھی پان کھالیتے ہیں۔ ہم چونکہ سگریٹ نہیں پیتے، اس لیے تم کو ہم سے چھپ کر سگریٹ پینا پڑرہی ہے۔ ہم نے سوچا کہ ہم تمہارے سامنے سگریٹ پینے لگیں تاکہ یہ عیب بھی تم

ہمارے سامنے کیا کرو"۔ میں اُس لمحہ نہ صرف شرمندہ ہوا بلکہ میں نے جھک کر ابّا کے پیر پکڑ لیے اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی سگریٹ نہیں پیوں گا۔

میرے دونوں بھائی عمر میں مجھ سے تقریباً چودہ پندرہ سال چھوٹے ہیں۔ میں جب باقاعدہ ملازمت کرتا تھا تو انہوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا۔ میں رات گئے گھر آ کر اپنا پرس میز پر رکھ دیا کرتا تھا۔ صبح عموماً مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے اس میں سے پیسے نکالے ہیں چنانچہ میں سب سے پوچھتا مگر ہر شخص انکار کر دیتا۔ ایک دن جب میں پیسے غائب ہونے کا شور مچا رہا تھا میرا چھوٹا بھائی اسکول سے واپس آ گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے بھی منع کر دیا۔ میں چونکہ غصہ میں تھا لٰہذا میں نے اُس کے طمانچہ رسید کر دیا۔ وہ رونے لگا۔ ابّا یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور نہایت نرم لہجے میں کہنے لگے "رضی تم کو یاد ہوگا کہ تم جب آٹھویں کلاس میں تھے تو ہماری دراز سے سو روپے غائب ہو گئے تھے۔ ہم نے تمہاری ماں سے اور گھر کے سب افراد سے دریافت کیا۔ تم سے بھی پوچھا مگر تم نے بھی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ ہوسکتا ہے ہمارا جو دوست مشترکہ پڑھائی کے لیے گھر آتا ہے اُس نے ہماری عدم موجودگی میں روپے نکال لیے ہوں۔ تمہاری یہ بات سن کر ہم نے تم سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ اپنے دوست کو چھت پر لے کر بیٹھا کرو۔ رضی۔ تم کو معلوم ہے جس وقت ہم تم سے یہ کہہ رہے تھے ہمارے پاس پورے ثبوت تھے کہ وہ روپے تم نے نکالے تھے مگر ہم نے تم سے اظہار نہیں کیا۔ صرف اس وجہ سے کہ تم شرمندہ نہ ہو۔ ہمارے اس عمل کا صلہ تم اس طرح ہمیں دے رہے ہو کہ ہر روز ہمارے بچے پر چوری کا الزام عائد کرتے ہو"۔ یہ بات کہتے ہوئے ابّا پر گریہ طاری ہو گیا اور میں بھی رونے لگا۔ ایسے متعدد واقعات

موجود ہیں جن سے ابّا کے اندازِ فکر کی غمازی ہوتی ہے مگر فی زمانہ شاید والدین کو اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ اپنی اولادوں کی اصلاح کے لیے کوئی مؤثر و مثبت طریقہ اختیار کر سکیں۔

قناعت اور ایثار

کراچی پہنچ کر ابّا نے نہایت تنگ دستی اور مشکل حالات میں زندگی آغاز کی تھی۔ کسبِ معاش کی اُن کو فکر ضرور رہتی تھی لیکن وہ حصولِ دولت کے حوالے سے کبھی حریص نہیں ہوئے۔ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہمیشہ جائز ذرائع اختیار کیے۔ پچیس سال مطب کرتے رہے لیکن کسی سے ایک ڈیڑھ روپے سے زائد معاوضہ نہیں لیا۔ اگر کوئی مریض زیادہ معاوضہ دینے پر اصرار کرتا تو فرماتے یہ رقم امانتاً دے جائیں کسی ضرورت مند کے علاج میں کام آجائے گی۔ وعظ و تقریر کا بھی معاوضہ طے نہیں کرتے تھے۔ جس نے جو دے دیا خاموشی سے شکریہ کے ساتھ رکھ لیا۔ شاید اسی لیے غریب علاقوں مثلاً لیاری، لی مارکیٹ، بھیم پورہ، رنچھوڑ لائن، بلدیہ ٹاؤن، لائنز ایریا وغیرہ کے لوگ اُن کو ایسی محافل میں ضرور بلایا کرتے تھے۔ اپنی آمد و خرچ کی ڈائریوں میں اس معاوضہ کی رقم کو بھی درج کرتے تھے۔ کوئی زیادہ معاوضہ دیتا تو اُس کے اندراج کے آگے "شکر الحمد اللہ" ضرور لکھتے تھے۔ آخر دنوں میں رحمت مسجد بھیم پورہ میں نمازِ جمعہ سے قبل تقریر کیا کرتے تھے۔ بہت باکمال اور شعلہ بیان مقرر تھے اس لیے جمعہ کی نماز میں بہت ہجوم ہوتا تھا مگر کبھی اپنی طلاقتِ لسانی کو قصہ کہانیوں، لعن طعن اور مناظرانہ مسائل کے لیے استعمال نہیں کیا۔ تمام تقریر قرآن و سنت کے حوالے سے ہوا کرتی تھی۔ اولیاء اللہ اور صوفیاء کے بہت قصے یاد تھے لیکن عوام کے سامنے کرامتوں کے بیان سے زیادہ ایسے واقعات

بیان کرتے تھے جن سے اصلاحِ نفس ممکن ہو سکے۔ عموماً فرماتے تھے کہ نفس کی
اصلاح ہی تمام عبادتوں اور اعمال کی قبولیت کی ضامن ہوتی ہے اور نفس اُس وقت
تک قابو میں نہیں آتا جب تک قلب پر خوفِ خدا کا غلبہ نہ ہو۔ ایک ڈائری میں لکھا
ہے کہ ”خوفِ خدا وہ کوڑا ہے جو ہر لمحہ رخشِ نفس کی سرزنش کرتا رہتا ہے۔ اس لیے
خوفِ خدا کو اپنے اندر فروغ دینا چاہیے اور ہر سانس خوشنودیٔ باری تعالیٰ کے حصول
کی جستجو میں رہنا چاہیے۔ خلقِ خدا کی دلجوئی بھی اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کا مستحسن
ذریعہ ہے۔ دوسروں کے اس طرح کام آؤ کہ وہ تمہارے عمل کو اپنے اُوپر احسان
تصور نہ کریں۔ کسی سے مالی تعاون اس طرح کرو کہ وہ شرمسار نہ ہو بلکہ اُس کو یہ
احساس ہو کہ شاید یہ اُسی کا مال تھا جو اُسے لوٹایا جارہا ہے۔ قرض لینے اور دینے سے
بچو لیکن اگر کوئی بحالتِ مجبوری قرض طلب کرے تو اپنے مال کو اللہ کا مال تصور
کرتے ہوئے اُسے قرضِ حسنہ کے طور پر قرض دو تاکہ اگر اس رقم کی واپسی نہ ہو تو
دل کڑھے نہیں اور تمہارا یہ عمل اللہ کے نزدیک ہمیشہ مستحسن رہے“۔

اَبّا نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال نہایت سادگی سے گزارے۔
حقوق العباد کو خوش اسلوبی سے پورا کرنے کی حد تک رزق کے حصول کے لیے
جدوجہد کرتے تھے اور ہمیشہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ پس انداز کرلیا کرتے تھے تاکہ
ضرورت کے لمحہ میں کسی سے قرض نہ مانگنا پڑے۔ میں نے اُن دنوں یہ محسوس کیا کہ
پس انداز کرنے کی عادت کی بنا پر اَبّا نے اپنی ذاتی خواہشوں کو ترک کرنا شروع
کردیا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ اُن کی خوش پوشا کی معروف تھی۔ شارک اسکن کی
شیروانی، ململ یا وائل کرتا، علی گڑھ کاٹ پائجامہ، مرادآبادی مخمل کی ٹوپی، علی گڑھ کے
پمپ شوز اُن کے لباس میں شامل تھے۔ بہترین عطر استعمال کرتے تھے جس کی خوشبو

فضا کو مہکا دیتی تھی۔ گھر سے باہر تو شیروانی کے بغیر نکلنے کا تصور ہی نہیں تھا لیکن کبھی
کبھی گھر پر آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے بھی شیروانی پہن کر آیا کرتے تھے۔ بعد
میں ایک واقعہ کے بعد شیروانی ترک کردی۔ وہ واقعہ بھی عجیب ہے۔ ہوا یہ کہ اُن کی
ایک رشتہ کی بہن نواب شاہ میں مقیم تھیں، اَبّا کو جب اُن کا علم ہوا تو مجھے ساتھ لے
کر اُن سے ملنے کے لیے نواب شاہ گئے۔ کچھ پھل اور کپڑے راستہ سے خریدے
اور مجھ سے فرمایا کسی کے گھر خالی ہاتھ جاتے ہوئے اچھا نہیں محسوس ہوتا۔ تحفہ دینا
ویسے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ جب بہن کے گھر پہنچے تو اندازہ
ہوا کہ بہن کی مالی حالت بہت سقیم اور دگرگوں ہے۔ بہنوئی کسی فیکٹری میں معمولی
تنخواہ پر ملازم تھے۔ بچے زیرِ تعلیم تھے حالات کا اندازہ لگانے کے بعد اَبّا نے اُن
سے دلجوئی کی گفتگو شروع کردی۔ بہن سے کہا دیکھو بھئی تمہارے ہاتھ کا جو کھانا
کانپور میں کھایا تھا اُس کی لذت آج تک زبان پر زندہ ہے۔ اس لیے آج اُس
لذت کی تجدید کردینا۔ بہن خوشی سے جھوم اُٹھیں۔ پھر فوراً کہنے لگے البتہ ایک فرق
آگیا ہے۔ اب مونگ کی زیرہ کے بگھار والی دال ہماری مرغوب غذاؤں میں شامل
ہے۔ گوشت، انڈہ، مرغی اور مچھلی کی طرف رغبت نہیں رہی۔ اس لیے کسی تکلف میں
مت پڑنا۔ بس مونگ کی دال پکالینا۔ رضی بھی مونگ کی دال شوق سے کھاتا ہے۔
یوں بھی سفر میں ہلکی غذا کھانا چاہیے۔ بہن افسردہ ہونے لگیں تو فرمانے لگے ”یقیناً تم
بہن ہو اور ہماری صحت کو تم سے زیادہ کون عزیز رکھے گا۔ البتہ لہسن اور پودینے کی
چٹنی پیس لینا کھانے کا لطف دوبالا ہوجائے گا“۔ بہن نے بہت ہی اصرار کیا مگر
مونگ کی دال پر ہی رکے رہے۔ تنہائی میں مجھے بھی تاکید کردی کہ دال کی تعریف
کرکے کھانا اور خود بھی کھانا کھاتے ہوئے مسلسل دعائیں دیتے رہے کہ اللہ تعالیٰ

تمہارے دسترخوان کو اپنی نعمتوں سے بھرا پرا رکھے اور رزق میں خوب برکت دے۔

صبح بہنوئی نے پیلی بھیت کے ایک صاحب کا تذکرہ کیا اور کہا کہ جب آپ کا تذکرہ آتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ کہیں تو مل لیں۔ پیلی بھیت کا نام سن کر ابّا باغ باغ ہوگئے اور کہنے لگے ضرور چلیں۔ بہنوئی نے جب کھونٹی پر سے اپنی شیروانی اُتار کر پہنی تو ابّا نے دیکھا کہ شیروانی بہت بوسیدہ ہے مگر وضع داری میں اس کا پہننا ضروری ہے۔ ابّا اس وقت بہت اعلیٰ کپڑے کی شیروانی زیب تن کیے ہوئے تھے۔ جب اُن کے بہنوئی نے شیروانی پہن لی اور چلنے کے لیے بالکل تیار ہوگئے تو اچانک ابّا نے اپنی شیروانی کے بٹن کھول دیئے۔ چہرے پر ایک الجھن نمایاں ہوگئی اور اسی دوران انہوں نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی۔ بہنوئی نے دریافت کیا کہ کیا ارادہ ہے تو فرمانے لگے ''شیروانی میں گرمی محسوس ہو رہی تھی اس لیے کُرتے میں چلیں گے۔ کراچی واپس آتے ہوئے اپنی شیروانی بہنوئی کو پہنا کر دیکھی اور خوب تعریف کی۔ کہا یہ آپ پر بہت سج رہی ہے، یہ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ بہنوئی نے قبول کرنے میں رد و کد کی اور کہا کہ آپ بغیر شیروانی کے گھر کیسے جائیں گے'' کہنے لگے ہم کو گھر ہی تو واپس جانا ہے۔ آپ اسے قبول کرلیں''۔ کراچی پہنچ کر فیصلہ کیا کہ اب وہی شیروانی استعمال کروں گا جو عام سی ہو۔ قیمتی کپڑے کی شیروانی تنگ دستوں کے لیے رنج اور اپنے لیے ذاتی تفاخر کا سبب بن سکتی ہے۔ بعد میں بہت عام کپڑے کی شیروانی سلوانے لگے اور بسا اوقات مطب بھی کُرتے پائجامے میں جانے لگے۔

ابّا کے ایک بہنوئی جن میں ساتوں شرعی عیب تھے اور اس بنا پر ابّا اُن سے نہیں ملا کرتے تھے، جب ایک موذی بیماری میں مبتلا ہوکر اسپتال میں داخل ہوگئے تو

ابّا روزانہ اُن کی عیادت کو اسپتال جانے لگے۔ بہنوئی جانتے تھے کہ یہ مرض الموت ہے لہٰذا ایک دن جب ابّا اُن کی عیادت کو پہنچے تو اُن پر گریہ طاری تھا۔ ابّا نے تسلی دینے کی کوشش کی تو کہنے لگے ''میں نے اچھی زندگی نہیں گزاری ہے۔ مجھ سے بہت گناہ سرزد ہوئے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ہاتھ پر تجدید ایمان کرلوں''۔ یہ سن کر ابّا پر گریہ طاری ہوگیا اور انہوں نے اُن سے کہا گناہ گار تو میں بھی ہوں اس لیے یہ جسارت کیسے کرسکتا ہوں لیکن اگر اس عالمِ بے بسی میں آپ کی اس عمل سے تشفی ہوسکتی ہے تو بسم اللہ۔ بہنوئی نے تجدید ایمان کے بعد ابّا سے کہا کہ ''میں اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آپ کے سامنے کچھ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں''۔ ابّا نے اُن کو روک دیا اور کہا کہ ''اگر آپ کے اعترافات میں کچھ اعمال ایسے ہیں جن پر شرعی حد لگتی ہے تو اُن کو میرے سامنے بیان نہ کریں بلکہ اپنے اعمال پر توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ستار العیوب ہے جب اُس نے ان تمام باتوں کو چھپا رکھا ہے تو آپ کیوں ان کو ظاہر کریں۔ بس کثرت سے استغفار کریں اور مجھے اپنے اعمال پر گواہ بننے سے بچائیں۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے''۔

ابّا نے جہاں اپنے روزنامچوں میں اپنی مصروفیات اور مشاہدات درج کیے ہیں وہاں انہوں نے اپنی پسندیدہ کتابوں کے حوالے سے بھی اپنے تاثرات درج کیے ہیں۔ یہ تاثرات اگرچہ تبصرے ہوگئے ہیں لیکن ان کے مطالعے سے ابّا کی پسند و ناپسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ ابّا نے اپنی پسند کے اقوال اور اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ملفوظات کا مطالعہ کرنے کے بعد جہاں اُس سے دیگر اقتباسات ایک روزنامچہ میں نقل کیے ہیں وہاں ایک اقتباس بڑا نافع اور بصیرت افروز نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

علیہ رحمہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''کم آؤ تا کہ محبت زیادہ ہوجائے'' پھر اس حدیث کی وضاحت میں گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا ''ملاقاتی چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو بمنزلہ غذا کے ہوتے ہیں جیسے خادم اور منکوحہ (بیوی)۔ ایک قسم وہ ہے جو بمنزلہ دوا کے ہوتی ہے جیسے حاکم اور رشتہ دار کہ اِن لوگوں سے کبھی کبھی واسطہ پڑتا ہے۔ ایک قسم مانند زہر کے ہوتی ہے جیسے کافر، مرتد، بدکار اور ضعیف الاعتقاد اور چوتھی قسم اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو سانس کی مانند ہوتے ہیں اور ہمہ وقت ساتھ رہتے ہیں جیسے معشوق وغیرہ''۔ سبحان اللہ

صلۂ رحمی

اَبّا کی چونکہ کوئی حقیقی بہن نہیں تھی اس لیے وہ اپنی رشتہ کی بہنوں سے شدید محبت کرتے تھے۔ سب کے گھر پابندی سے جاتے اور جب جاتے کوئی تحفہ لیکر جاتے۔ بہنیں بھی اُسی طرح اَبّا پر جان چھڑکتی تھیں۔ خاص طور پر اَبّا کی خالہ زاد بہنیں تو ہر کام میں اَبّا سے مشورہ کرتی تھیں اور اپنے بچوں کے نکاح بھی اَبّا سے پڑھواتی تھیں۔ اسی طرح پھوپھی زاد بہنیں بھی اپنے حقیقی بھائیوں سے زیادہ اَبّا کو چاہتی تھیں اور اپنی ضرورت کے لمحوں میں اَبّا کی ہی طرف دیکھا کرتی تھیں۔ اَبّا حتی الامکان رشتہ داروں سے تعلق کو قائم رکھنے پر زور دیتے تھے۔ خصوصاً میری والدہ کے رشتہ داروں کا تو اَبّا بے حد خیال رکھتے تھے۔ مالی تعاون اُن کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ کسی کو مشکل اور تنگ دستی میں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اپنی محدود آمدنی سے ہر ماہ ایک حصہ اسی مقصد کے لیے علیحدہ کردیا کرتے تھے اور اس تمام صورتحال سے مجھ کو آگاہ رکھتے تھے تا کہ میری بھی اُن کے مزاج پر تربیت ہوسکے۔ میری بڑی خالہ کے

صاحبزادے ولایت حسین جن کو ہم بھائی میاں کہتے تھے اور جو میری والدہ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے اُن کو اَبّا اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ذاتی زندگی کے حوالے سے اُن سے مشورہ کرتے اور کہتے تھے ولایت حسین میرا مزاج شناس ہے۔ پیلی بھیت ہاؤس کی خریداری اور ابتدائی تعمیر میں بھی بھائی میاں سے ہی مشورے کیے۔ اپنے بہنوئیوں کا تذکرہ بڑے ادب اور محبت سے کرتے تھے، خصوصاً سیّد مختار علی نقوی، کرنل صدیق اللہ اور سیّد امتیاز علی پر جان چھڑکتے تھے۔ اَبّا نے ایک ڈائری ''حکیم قاری احمد کا خاندان'' کے عنوان سے بنائی تھی، اس ڈائری میں انہوں نے اپنے دادا کا خاندان، اپنی دادی اور والدہ کا خاندان، اپنی اہلیہ کا خاندان، اپنے والد کی خالاؤں کا خاندان، اپنی پھوپھیوں کا خاندان، اپنے دادا کے بھائی مولانا عبداللطیف سورتی کا خاندان، ان خاندانوں کی دوسری اور تیسری نسلوں کی تاریخِ پیدائش اور تاریخ انتقال، شادیوں کی تاریخیں، بچوں کا احوال اور اُن شہروں کا احوال بھی درج کیا ہے جہاں جہاں رشتہ داریاں ہوئیں۔ یہ ڈائری ایک دستاویز کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ اَبّا کے انتقال کے بعد میں نے بھی اس میں اضافے کیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ چوتھی نسل کے حوالے سے کچھ تفصیلات شامل ہوجائیں۔ یہ ڈائری میری چھوٹی بہن ڈاکٹر راشدہ قاری کی تحویل میں ہے اور وہ ارادہ رکھتی ہیں کہ اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تمام بہن بھائیوں کو فراہم کردی جائیں۔

مجھ سے اَبّا فرمایا کرتے دوستوں سے بھی تعلق کو دُور تک اور دیر تک نبھایا کرو۔ اگر کسی دوست سے گزند یا تکلیف پہنچے تو اس کا تذکرہ گھر پر نہ کیا کرو تا کہ اگر وہ کبھی تمہارے دروازہ پر آئے تو اُس کو وہی عزت ملے جو اُس کا حق ہے۔ مطلب براری اور خودغرضی اللہ کو پسند نہیں۔ حسد اور غیبت دل کو زنگ آلود کرتی ہے۔ غیبت کرنے

والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ بدگمانی دل کو پراگندہ کرتی ہے۔ دوسروں کے حُسن پر نظر رکھا کرو عیب پر نہیں۔ ایسا کرنے سے اُنسیت اور محبت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

عجیب مزاج تھا اَبّا کا۔ دوسروں کے اصلاحِ احوال پر خاص توجہ دیتے۔ چھوٹوں کو نصیحت کرتے اور بزرگوں سے فرماتے مجھ کو کوئی نصیحت کردیں۔ مجھے یاد ہے کہ اَبّا کے مطب کے سامنے پان والے کی ایک دکان تھی اور اطراف میں مکانات۔ ایک میمن لڑکا جس کا نام حنیف تھا بی کام کرنے کے بعد بینک میں ملازم ہوگیا تھا۔ شام کو گھر آنے کے بعد وہ نہادھوکر پان والے کی دکان پر آکر کھڑا ہوجاتا۔ اَبّا نے محسوس کیا کہ حنیف بازار میں آتی جاتی اور مکانات کی کھڑکیوں میں کھڑی عورتوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہ بات اَبّا کو ناگوار گزرتی تھی۔ ایک دن انہوں نے حنیف کو مطب میں بلایا اور اُس سے کہا پان والے کی دکان پر مت کھڑے ہوا کرو۔ بازار کی رونق ہی دیکھنا ہے تو ہمارے مطب کی دروازے کے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر بازار کی رونق دیکھا کرو۔ ہمارے پاس اہلِ علم آتے ہیں اُن کی گفتگو سنا کرو علم میں اضافہ ہوگا اور دین کی فہم پیدا ہوگی۔ حنیف نے آمادگی ظاہر کی اور وہ شام کو پابندی سے مطب آنے لگا۔ ایک دن کسی بنا پر نہیں آیا تو اَبّا نے اُس سے کہا کہ سامنے کی دکان سے ہمارے لیے دو پان لیکر آیا کرو کیونکہ کل تم نہیں آئے تو ہمیں تمہارا انتظار نہیں رہا۔ شاید پان کی بنا پر ہم تمہارا انتظار کرنے لگیں۔ بعد میں محمد حنیف نے اَبّا سے قرآن حکیم اور عربی پڑھنا شروع کی اور بالآخر وہ ایک سعودی بینک میں ملازم ہوکر ریاض چلا گیا۔

اولاد کی تربیت

اَبّا نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اپنے بچوں کی تربیت، بہتر پرورش اور تعلیم پر ہمیشہ توجہ دی۔ وہ ہفتہ میں دو ایک دن بعد ضرور سب کو بٹھا کر اُن کی تعلیم کے حوالے سے معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ لڑکیوں میں میری بہن صفیہ قاری اور لڑکوں میں چونکہ میں بڑا تھا اس لیے ہم پر اَبّا کی توجہ زیادہ رہتی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ بڑے بچے ریل کے انجن کی طرح ہوتے ہیں۔ انجن آگے بڑھے تو دوسرے ڈبّے بھی آگے بڑھیں گے۔ لڑکیوں میں راشدہ سب سے چھوٹی تھیں اور لڑکوں میں ولی حیدر ذاکر۔ اس لیے اِن دونوں سے اَبّا کو خصوصی محبت تھی۔ دونوں کے خوب ناز اُٹھاتے تھے اور اگر کوئی ان کے ساتھ زیادتی کرتا تو سرزنش کرتے۔ صفیہ قاری سے لیکر راشدہ قاری تک اور مجھ سے لیکر ولی حیدر ذاکر تک سب کو لکھنے پڑھنے کا شوق رہا اور اَبّا کی زندگی ہی میں سب کے مضامین اخبارات و رسائل میں شایع ہونے لگے۔ کسی بچے کا مضمون جس دن شایع ہوتا تھا اُس دن اَبّا کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ اُس دن مطب سے واپسی پر وہ پھل یا مٹھائی لیکر گھر آتے تھے اور جس کا مضمون شایع ہوتا تھا اُسے انعام دیتے تھے۔ صفیہ قاری نے بہت مضمون لکھے لیکن شادی کے بعد وہ اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکیں۔ مجھے یاد ہے کہ اَبّا کے انتقال سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل روزنامہ حریت کراچی میں ۲۹؍مارچ ۱۹۷۶ء کو میری بہن زاہدہ قاری کا مضمون حضرت شاہ فضل رحماں گنج مراد آبادی پر شایع ہوا تھا۔ اُس دن علالت کے باوجود اَبّا بہت خوش تھے۔ انہوں نے زاہدہ کو بطور انعام دس روپے دیئے تھے۔ شاہدہ قاری اور خالدہ قاری بھی پابندی سے لکھا کرتی تھیں۔ البتہ میرا چھوٹا بھائی وصی حیدر عمار ڈرائنگ کی طرف راغب تھا، بعد میں وہ باقاعدہ مصوری کی

سمت نکل گیا اور اپنے شعبہ میں بہت معروف و مقبول ہے۔ یہ سب اَبّا کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اُن کے تمام بچے اپنے اپنے شعبوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ اَبّا کی مغفرت فرمائے اور اُن کی اولادوں کی اولادوں میں بھی علمی ذوق شوق کو ارزاں کرے۔

شوہر پرست خاتون

میرے والد اور والدہ میں بے پناہ محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی دلداری اور خبر گیری کے لیے مستعد رہتے تھے۔ اَبّا کو مرد ہونے کے ناتے اکثر غصہ بھی آجاتا تھا لیکن امّاں خاموش ہی رہتی تھیں۔ میں نے کبھی امّاں کو اَبّا سے اختلاف کرتے نہیں دیکھا۔ وہ نہ صرف ایک روایتی شوہر پرست خاتون تھیں بلکہ وہ اَبّا کو دیوتا تصور کرتی تھیں۔ اُن کے اس رویہ نے اُن کے اندر اطاعت، فرمانبرداری اور خدمت کا ایک ایسا جذبہ پیدا کردیا تھا کہ اَبّا کے رشتہ داروں سے بھی امّاں ایسا سلوک کرتی تھیں کہ سب امّاں کے گرویدہ رہتے تھے۔ اَبّا کی خالہ حبیبہ خاتون کے ہاں وہ پابندی سے جاتی تھیں اور اُن کے سر میں تیل ڈال کر کنگھی کرتی تھیں اور جب وہ دعائیں دیتی تھیں تو اماں اُن سے درخواست کرتی تھیں کہ خالہ جان مجھے دعا دینے کے بجائے اپنے بھانجے کی صحت و سلامتی کے دعا کیا کریں کہ وہ میرے اور بچوں کے سرپرست ہیں۔ اُن کی فرض شناسی سے ہمارا سارا گھر منور ہے۔ اَبّا عموماً امّاں سے کہتے تھے کہ اس پابندی سے خدمت گزاری کے نتیجہ میں لوگ اپنا مطیع سمجھنے لگتے ہیں۔ ہر شخص اپنے کام بتا دیتا ہے۔ مگر امّاں تھیں کہ کبھی اپنے سلوک سے دست کش نہیں ہوئیں حتیٰ کہ اَبّا کے انتقال کے بعد بھی تمام بزرگ رشتہ دار خواتین کی خدمت

کے لیے مستعد رہتی تھیں۔ امّاں کی یہی صورتحال دیکھ کر امّاں کی بڑی بہن یعنی ہماری خالہ امّاں کہتی تھیں کہ ''سیدہ'' جنتی ہے۔ اَبّا کے انتقال کے بعد امّاں تقریباً پندرہ سال حیات رہیں اور ان پندرہ سال کے دوران انہوں نے اَبّا کے کمرے کو اُسی حالت میں رکھا جیسا کہ وہ اَبّا کے انتقال کے وقت تھا۔ ہفتہ میں دو مرتبہ بستر کی چادر تبدیل کرتیں، تکیہ غلاف بدلتیں اور جوتے صاف کرکے پلنگ کے نیچے رکھا کرتی تھیں۔ بچے کبھی کبھی اس حوالے سے امّاں کو چھیڑتے اور کہتے امّاں اَبّا اب نہیں آئیں گے۔ یہ آپ کیا کرتی ہیں تو وہ رونے لگتی تھیں اور کہتی تھیں مجھے خدا کو منہ دکھانا ہے میں اُن کی خدمت سے کیسے ہاتھ اٹھالوں۔

دل آزادی سے گریز

اَبّا ہمیشہ دوسروں کی دل آزاری سے بچتے تھے۔ دانستہ یا نادانستہ کوئی ایسا عمل پسند نہیں کرتے تھے جس سے دوسروں کو رنج پہنچے۔ فرماتے تھے کہ دوسروں کو رنج پہنچا کر آدمی اپنے اُوپر دعاؤں کے دروازے بند کرلیتا ہے۔ کسی کو کبھی شرمندہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ فرماتے تھے شرمندگی اللہ کے سامنے اچھا عمل ہے اس لیے جو شخص دوسروں کو اپنے سامنے شرمندہ کرتا ہے وہ اللہ کے حق میں رخنہ ڈال کر مزید گنہگار ہوتا ہے۔ اپنے مطب ''سورتی دواخانے'' میٹھادر سے اُٹھ کر عشاء بعد پیدل لی مارکیٹ کے بس اسٹاپ پر آتے اور وہاں سے بس میں بیٹھ کر گھر آجاتے۔ اگر کبھی کوئی مریض جس کے پاس موٹر ہوتی گھر پہنچانے کی خواہش ظاہر کرتا تو شکریے کے ساتھ معذرت کرلیتے۔ فرماتے اس قسم کی سہولت کو اپنے معمولات میں قبول کرلینے سے نہ صرف طبیعت میں کاہلی پیدا ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات آدمی اس کاہلی کی زد میں

آکر ایسے لوگوں کا انتظار کرنے لگتا ہے جن سے سواری کی سہولت میسر آسکے۔ توقع کا در ہمیشہ اللہ کی طرف کھلنا چاہیے۔

لی مارکیٹ کے فٹ پاتھ پر ایک نوجوان مرزا خان بلوچ انگوٹھیاں فروخت کرتا تھا اُس نے کسی دن رحمت مسجد میں اَبّا کی تقریر سنی لہٰذا وہ اَبّا کا حد درجہ احترام کرنے لگا۔ ایک دن جب اَبّا بس کا انتظار کررہے تھے مرزا خان نے سامنے والی دکان سے اسٹول مانگ کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا اور اَبّا سے درخواست کی کہ جب تک بس نہ آجائے وہ اُس پر بیٹھ جائیں۔ اَبّا نے اسٹول پر بیٹھنے سے منع کردیا اور اُس کی خوشنودی کی خاطر اُس کے قریب ہی زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گئے اور اُس سے حال احوال دریافت کرنے لگے۔ یہ نوجوان بلوچ خاران بلوچستان کا رہنے والا تھا اور روزی روٹی کے حصول کے لیے کراچی میں مقیم تھا۔ بعد میں اس نوجوان سے اَبّا کے ایسے مراسم ہوئے کہ اُسے اَبّا نے قرآن حکیم پڑھانا شروع کردیا اور اپنے مطب میں رہنے کی جگہ دیدی۔ مرزا خان بلوچ تقریباً دس سال اَبّا کے ساتھ رہا۔ وہ اُن کو استاد کہتا تھا اور بے پناہ عزت کرتا تھا۔ اَبّا کے انتقال کے بعد مرزا خان نے مجھے ایک عجیب وغریب واقعہ سنایا۔ اُس نے کہا کہ ''ایک مرتبہ میں اور استاد بس میں سفر کررہے تھے۔ استاد کے برابر بیٹھے ہوئے شخص نے اچانک استاد سے گفتگو شروع کردی اور استاد بھی اُسے جواب دیتے رہے۔ اُس زمانے میں کراچی میں قصائیوں کی ہڑتال جاری تھی اور کسی صورت ختم نہیں ہورہی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ شخص استاد کو قصائی سمجھ رہا ہے اور ہڑتال ختم کرنے کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ ہم کو غصہ آگیا اور ہم نے اس سے بولا ''اڑے یہ عالم ہے۔ استاد ہے۔ تم اس کو کیا سمجھ رہا ہے'' ابھی ہم اُس کو گریبان سے پکڑنے والا تھا کہ استاد نے ہم کو ڈانٹ دیا اور کہا

کہ ''چپ رہو بات کرنے دو''۔ وہ آدمی شرمندہ ہونے لگا تو استاد نے اُس سے معافی مانگتے ہوئے کہا ''آپ بات کریں۔ اس کی گفتگو پر توجہ نہ دیں''۔ بقول مرزا خان بس سے اترنے کے بعد اَبّا نے مرزا خان کو سمجھایا کہ اگر وہ قصائی سمجھ رہا تھا تو سمجھنے دیتے۔ بس کا سفر ہوتا ہی کتنا مختصر ہے۔ اس دوران اگر کوئی تم کو تمہارے مرتبے کے مطابق نہیں سمجھ رہا ہے تو اُس کو شرمندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُس کی خوشی میں خوش رہنا چاہیے۔

اَبّا عموماً فرمایا کرتے تھے کہ ''زندگی بھی ایک طرح بس کا سفر ہوتی ہے۔ اس میں نہ ہر شخص ہم مزاج ہوتا ہے اور نہ ہم لباس، سب الگ الگ ہوتے ہیں۔ بس چلتی رہتی ہے اور ہر مسافر اپنی منزل آنے پر اتر جاتا ہے۔ دوران سفر بعض ہم سفروں کے کپڑوں سے بدبو آرہی ہوتی ہے۔ کوئی سگریٹ نوشی کررہا ہوتا ہے اور کوئی بلاضرورت گفتگو پر اُکستانا ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نظر اپنی منزل پر ہوتی ہے وہ اِن تمام چیزوں کو برداشت کرتے ہیں اور اپنی منزل کا سکون کے ساتھ انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں زندگی میں بھی درگزر کا اصول اپنانا چاہیے''۔ اَبّا نے ہمیشہ درگزر سے کام لیا۔ حتیٰ کہ اپنے کھلے ہوئے دشمنوں کو بھی معاف کردیا اور یہ ہی اُن کی ایسی عدات تھی جس نے اُن کو سب کا دوست بنادیا تھا۔

دُعا کی اہمیت

اَبّا کی ایک اور عادت بڑی مستحسن تھی۔ وہ عید، بقرعید، شب برأت، شب معراج کے موقع پر کسی بزرگ سے ضرور ملاقات کرتے اور اُس سے اپنے حق میں دعا کرواتے۔ ایسے مواقع پر میں عموماً ساتھ ہوتا تھا۔ ایک دن اَبّا مجھے ساتھ لیکر

چار نمبر ناظم آباد میں ایک مکان پر گئے اور دستک دی۔ تھوڑی دیر میں ایک صاحب نکلے تو اُن سے کہا کہ ایک بزرگ عموماً آپ کے مکان کی چھت پر ٹہلتے ہیں اُن سے ملنا ہے۔ اُن صاحب نے پوچھا کیا آپ اُن کو جانتے ہیں۔ اَبّا نے جواباً کہا، نہیں میں اُن کو جانتا نہیں ہوں لیکن یہاں سے گزرتے ہوئے جب اُن پر نظر پڑتی تو یہ سوچتا تھا کہ ایک دن ان سے اپنے حق میں دعا کرواؤں گا''۔ اُن صاحب نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا ''ٹھہریے میں معلوم کرتا ہوں وہ میرے والد ہیں''۔ تھوڑی دیر میں ایک نہایت نورانی صورت والے بزرگ اندر سے برآمد ہوئے اور اَبّا نے بلاتکلف اپنی آمد کا مقصد بیان کردیا۔ وہ بزرگ پہلے تو گم سم کھڑے رہے، پھر رُندھی ہوئی آواز میں کہنے لگے ''میں تو گنہگار آدمی ہوں۔ میری دعا مستجاب کیسے ہوسکتی ہے''۔ اَبّا پر بھی گریہ طاری ہوگیا اور اُن سے کہا کہ جب میرے دل نے آپ کو قبول کرلیا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی آپ کی دعا کو قبول کرلے گا۔ معمولی ردّ و کد کے بعد اُن بزرگ نے نہایت پُرسوز انداز میں اپنے اور اَبّا کے لیے اس طرح دعا کی کہ میری بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔

فہمِ قرآن و حدیث

اَبّا اگرچہ اجتماعی اصلاحِ احوال کے قائل تھے اور اصلاح کے لیے رابطہ کو ضروری تصور کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ہمیشہ کم آمیز اور گوشہ گیر رہے۔ مذہب اور مسلک کے حوالے سے کسی بحث میں نہیں پڑتے تھے۔ کہتے تھے ہر شخص کو اپنے عقائد عزیز ہوتے ہیں اس لیے کسی سے حجت نہیں کرنا چاہیے۔ بس حق واضح کیا جائے اور وہ بھی اس طرح کہ دوسرے کی دلآزاری نہ ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ

ایسے تمام افراد سے کنارہ کش رہتے تھے جو غیر ضروری طور پر اپنے مسلک و موقف کو دوسروں پر مسلط کرنے میں سرگرم دکھائی دیتے تھے۔ اَبّا کہتے تھے کہ ''مذہبی اختلافات پر گفتگو کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیمات اور احادیث نبوی ﷺ پر غور کیا جائے۔ کیونکہ قرآن و سنت پر عمل اور اُن کا فہم ہی دین کی اساس ہوتا ہے۔ فرقہ بندی سے اُن کو شدید دکھ ہوتا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ فرقوں کی افزائش کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات سے وہ تعلق نہیں رہا جس کا اسلام مطالبہ کرتا ہے۔ قرآنی احکامات سے دوری، موضوع احادیث کی کثرت اور انسانی اقوال پر بھروسے کا نتیجہ سوائے فرقہ بندی کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ جو لوگ قرآن حکیم کو پڑھتے اور سمجھتے ہیں اُن کے اخلاق شائستہ اور تنگ نظری و فرقہ بندی سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں دو ہی باتیں انسان کو صحیح معنیٰ میں مسلمان اور مومن بنا سکتی ہیں، ایک فہم قرآن اور دوسرے سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ''۔

میرے دوستوں میں اَبّا کو وہ لوگ ہمیشہ عزیز رہے جن کا علم و ادب سے کوئی تعلق تھا۔ حسن عسکری فاطمی، افسر آذر، عبدالرؤف عروج، انور مشہود، ممتاز احمد، قاضی اعجاز احمد فاروقی، میاں عبدالرؤف، یاسین طالب، سرفراز احمد خاں، رئیس احمد صدیقی، نصیر ترابی، ممنون الرحمٰن خاں، ظہور خان نیازی، منور حسن خاں، احمد عمر، جمیل یار خان اور عظیم احمد صدیقی جب میرے پاس آتے تو اَبّا ان کی عزت کرتے اور اِن سے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے۔ شاعروں اور ادیبوں سے بھی اَبّا کے مراسم تھے۔ بہزاد لکھنوی، سوز شاہجہاں پوری، منور بدایونی، ماہر القادری، ضیاء القادری بدایونی، ضامن حسین گویا جہان آبادی، صابر براری، رسا چغتائی، وقار صدیقی

اجمیری، عارف سنبھلی، نازش حیدری، انعام گوالیاری، سمیع الحق علیگ، اسحٰق اطہر
صدیقی، شاہ خلیل اللہ جنیدی، احسان امروہوی، مہر پیلی بھیتی، حافظ محمد زاہد، سیف
شادانی، شاعر لکھنوی، محمد فاروق شمس، مقرب پیلی بھیتی، ایوب پیام اور محمد یوسف
طرب شمسی پابندی سے اَبّا سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ علماء اور اہلِ علم میں مولانا
عبدالحامد بدایونی، مولانا مفتی محمد عمر نعیمی، مولانا امیر احمد چودھپوری، مولانا محمد
ایوب دہلوی، مولانا امجد العلی رامپوری، ابن حسن جارچوی، مولانا حسن مثنیٰ ندوی،
علامہ رشید ترابی، بابائے صحافت سرحد اللہ بخش یوسفی، مولانا ناصر جلالی، مولانا جمیل
احمد نعیمی، مولانا محمد بشیر کاشمیری، آزاد بن حیدر ایڈوکیٹ، مولانا عبدالحکیم خطیب، مولانا
محمد عمر مٹھائی والے، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، مولانا حامد حسن قادری، انتظام اللہ شہابی،
الطاف علی بریلوی، مولوی محمد سعید (قرآن محل) مفتی ولی حسن ٹونکی، مولانا منتخب الحق
قادری، مولانا فضل الرحمان انصاری، مولوی ریاض الدین اکبرآبادی، نواب صولت
علی خان، ماسٹر مظہر جلیل شوق، مولانا شفیع اوکاڑوی، مولانا عبدالقیوم ندوی، مولانا
ابوجلال ندوی، حکیم محمود احمد عباسی، مولانا مصطفیٰ جوہر، آقائے مہدی پویا اور مولانا
تقدس علی خاں بریلوی سے اَبّا کے قریبی مراسم استوار ہوئے۔

اتحاد بین المسلمین

اَبّا اگرچہ علمائے اہلسنّت کے ایک معروف علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے
اور اس حوالے سے انہوں نے متحدہ ہندوستان میں بھی اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی
ممتاز علماء کرام سے بھی ربط و ضبط پیدا کیا اور کوشش کی وہ فرقہ واریت کے اسباب و
علل کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرکے باہم نفرتوں کی وجوہات کو دریافت کریں۔ اَبّا کے

اساتذہ میں جہاں اُن کے خانوادے کے علماء جو بریلوی مکتبۂ فکر کے ترجمان تھے
شامل رہے، وہاں خیرآبادی مکتبۂ فکر کے علماء سے بھی انہوں نے اکتسابِ علم کیا۔
دیوبندی مکتبۂ فکر کے عالم مفتی کفایت اللہ بھی اُن کے استاد رہے۔ اس کے علاوہ
گولڑہ شریف کے علماء کے سامنے بھی انہوں نے زانوئے تلمذ طے کیا، مگر وہ ہمیشہ
مسلک اہلسنّت پر قائم رہے یعنی وہ "اشعری ماتریدی دبستان" سے تعلق رکھتے تھے۔
ہندوستان میں تاج العلماء حضرت مولانا مفتی نعیم الدین مرادآبادی، امام المتکلمین
حضرت مولانا مشتاق احمد کانپوری، مولانا عبدالمقتدر بدایونی، پیر سیّد جماعت علی شاہ
محدث علی پوری، پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی، حجت الاسلام مولانا حامد رضا خان
بریلوی، مفتیِ اعظم مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی اور حضرت سیّد محمد محدث کچھوچھوی
کے وہ صحبت نشین رہے اور پاکستان میں بھی مولانا سیّد ابوالحسنات لاہوری، پیر سید
غلام محی الدین گولڑوی، مولانا منتخب الحق، مولانا سیّدابوالبرکات لاہوری، مولانا
عبدالحامد بدایونی، مولونا عبدالسلام باندوی، حضرت مولانا سردار احمد لائلپوری، مولانا
تقدس علی خان بریلوی، مولانا امیر احمد جودھپوری وغیرہ سے تعلق اور رفاقت کو انہوں
نے عزیز رکھا مگر اس کے باوجود اتحاد بین المسالک اُن کا مطمع نظر رہا۔ اسی حوالے
سے انہوں نے جہاں دیوبندی علماء میں مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا احتشام الحق
تھانوی، مفتی ولی حسن ٹونکی وہاں شیعہ علماء میں آقائے مہدی پویا، آقائے شریعت
مدار، علامہ رشید ترابی، مولانا مصطفیٰ جوہر، مولانا ابن حسن جارچوی وغیرہ سے مراسم
استوار کیے۔ خصوصاً مولانا عبدالحامد بدایونی کی معیت میں انہوں نے اتحاد بین
المسلمین کے لیے عملی جدوجہد کی لیکن بالآخر اُن پر یہ واضح ہوگیا کہ فرقہ واریت کے
فروغ کا اصل سبب بھی یہی علمائے کرام ہیں اور اس کے خاتمہ کی راہ میں بھی سب

سے بڑی رکاوٹ یہی لوگ ہیں۔ اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے اَبّا نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ”علماء نے فروعی اختلافات کا جو جال بچھا رکھا ہے اُسے دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ شاید تمام علماء صرف ایک بات پر باہم متفق ہیں کہ وہ کسی بات پر متفق نہیں ہوسکتے۔ علماء کا یہی مفروضہ اتفاق معاشرے میں صحیح اسلامی تعلیمات کے نفاذ اور فروغ میں حائل ہے۔ پہلے میں ایک مثال سے بہت برگشتہ ہوجاتا تھا کہ ”دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد“ مگر تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں اب اس مثال کو اعتدال سے سن لیتا ہوں“۔ علمائے کرام پر تنقید اور اُن کے رویوں پر اظہارِ تنفر نے اَبّا کے اندر ملال کی ایک ایسی صورتحال کو فروغ دیا جس کے زیرِ اثر وہ ابتداً کم آمیز اور بعد میں بڑی حد تک گوشہ گیر ہوگئے۔

خوش طبعی

اَبّا کے وجود میں ذاتی زندگی کے حوالے سے جہاں بہت ساری خوشیاں موجود تھیں وہاں احساس کے حوالے سے بعض دکھ ایسے تھے جو تمام عمر اُن کے ساتھ رہے۔ ان میں سب سے پہلا دکھ اپنے جڑواں بھائی مولانا فضل احمد صوفی کی ایک ایسے وقت میں وفات تھی جس وقت پاکستان کی سرزمین پر اُن کے قدم نہیں جمے تھے۔ پاکستان کے قیام کی خوشی اُن کی سب سے اہم سرشاری تھی لیکن اپنے آبائی درو بام کے چھوٹ جانے اور عزیزوں، رشتہ داروں سے دُوری کا دکھ اُن کو پوری زندگی آواز دیتا رہا۔ کسی خوشی کے لمحے میں اپنے بزرگوں اور دُور افتادہ اعزاء کو یاد کرنا اُن کی عادت ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے اندر فطری خوش طبعی کو

برقرار رکھا۔ وہ عموماً سامنے کی باتوں میں مزاح پیدا کردیا کرتے تھے۔ اُن کی بعض تحریروں میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔ ماہنامہ ”پیامِ حق“ اگرچہ مذہبی رسالہ تھا لیکن اَبّا اپنی افتادِ طبع کی بنا پر اس رسالہ کے اداریہ میں پاکستان کی جاریہ سیاست کے حوالے سے بھی اظہارِ خیال کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ”پیامِ حق“ میں ایک فکاہیہ کالم ”قلمدان۔ قاری کے قلم سے“ بھی ایک عرصہ تک لکھا۔ اس کالم میں عموماً وہ ہر ماہ کی نمایاں خبروں پر فکاہیہ انداز میں تبصرہ کرتے تھے۔ یہ تبصرے بہت دلچسپ اور اَبّا کی خوش طبعی کے بہترین ترجمان ہیں۔ کاش کوئی ادارہ ان کالموں کو یکجا کرکے کتابی صورت میں شائع کردے تو یہ کالم ۱۹۶۱ء سے لیکر ۱۹۷۶ء تک کی سیاسی اور غیر سیاسی غیر متوازن صورتحال کی ایک طانزانہ تاریخ کا درجہ رکھتے ہیں۔

اپنی خود نوشت ”قاری کی کہانی۔ قاری کے قلم سے“ میں ابا ایک جگہ جہاں ”پان“ کے حوالے سے بڑی معلومات افزاء گفتگو کی ہے، وہاں معروف انشاء پرداز مہدی حسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”پان اور بیگم کے ہاتھ سے، لطف دگنا، گویا سونے پر سہاگہ ہوجاتا ہے“۔ اسی گفتگو کے اختتام پر لکھا ہے کہ ”رامپور میں رواج تھا کہ شادی کے وقت پاندان کے خرچ کے نام پر کچھ رقم ہر ماہ دینے کا اقرار نامہ دولہا سے لکھایا جاتا تھا۔ شاید اسی لیے رامپور میں بھی پان کھانے کا زیادہ رواج تھا۔ کاش! میں بھی نکاح کے وقت اپنی بیوی کو ایسا ہی کوئی اقرار نامہ لکھ دیتا تو آج بے چارے ”پاندان“ کو اس لاوارثی سے نجات مل جاتی۔ مگر اب کیا ہوسکتا ہے جبکہ ہم دونوں ہی خزاں رسیدہ ہوچکے ہیں“۔

اسی طرح حقہ کے حوالے سے بھی ایک تحریر موجود ہے جس میں حقہ کی مختلف اقسام بیان کرتے ہوئے کئی واقعات درج کیے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان

میں بعض لوگ حقہ بڑے اہتمام سے پیتے تھے۔ حقہ کی فرشی میں پانی کی جگہ عرقِ گلاب اور کیوڑہ استعمال کیا جاتا تھا اور تمباکو میں مختلف قسم کی خوشبوئیں شامل کی جاتی تھیں۔ میں نے اس اہتمام سے حقہ پیتے ہوئے صرف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو دیکھا تھا۔ ہندوستان میں اکثر علماء حقہ پیا کرتے تھے۔ اَبّا نے اس ضمن میں یہ واقعہ بھی درج کیا ہے کہ ''میرے دادا حضرت محدث سورتی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ساورا (پہلے زمانے میں ایک خوبصورت کیتلی کے نیچے انگیٹھی لگی ہوتی تھی، جس کو ساورا کہا جاتا ہے) ہمہ وقت گرم رہتا تھا جس سے وہ ہر وقت قہوہ پیتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت پیلی بھیت تشریف لائے ہوئے تھے اور گفتگو کے دوران حقہ پی رہے تھے، حضرت محدث سورتی نے ایک مرحلہ پر اعلیٰ حضرت سے دریافت کیا کہ ''حضرت جنت میں آپ کو چلم گرم کرنے کے لیے آگ کہاں سے دستیاب ہوگی''۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت اس سوال پر مسکرائے اور محدث صاحب سے فرمایا۔ ''آگ میں آپ کے ''ساوار'' سے لے لیا کروں گا''۔

پیلی بھیت کے ایک روہیلہ پٹھان طرّہ باز خان کی محفلِ حقہ کا بھی اَبّا نے تذکرہ کیا ہے۔ لکھا ہے کہ طرّہ باز خان کی محلے میں پرچون کی دکان تھی۔ سب اُن کا احترام کرتے اور ''طرّا چچا'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اُن کی دکان کے سامنے سے بیل گاڑیاں بھٹے کی اینٹیں لیکر گزرا کرتی تھیں۔ طرّہ چچا سب گاڑی والوں کو حقہ کے کش لگواتے اور ایک دو اینٹ لے لیا کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے پختہ مکان بنوالیا تھا۔ میرے دادا حضرت محدث سورتی کے بڑے معتقد تھے۔ ایک مرتبہ محدث صاحب سے اُن کے کچھ مخالفوں نے اختلاف کیا اور بات بڑھ گئی۔ طرّہ چچا

نے یہ صورتحال دیکھی اور مخالف سے مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھتے تو تہبند (لنگی) اُتار کے ایک طرف پھینک دیا اور کہنے لگے آجاؤ۔ سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور محدث صاحب چلاتے رہ گئے کہ ''ارے طرّہ باز خان یہ کیا کرتے ہو، یہ کیا کرتے ہو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ''۔

اَبّا انگریزی زبان سے تقریباً ناواقف تھے۔ بہت بعد میں انگریزی میں اپنا نام لکھنا اور دستخط کرنا سیکھ لیے تھے۔ بعض انگریزی کے الفاظ روز مرّہ کے استعمال کی بنا پر اُن کی سمجھ میں آجاتے تھے لیکن وہ ان الفاظ کو سمجھتے ہوئے بھی ایسا ظاہر کرتے تھے کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آئے۔ خاص طور پر اُس وقت تو وہ بالکل انجان بن جاتے جب کوئی غیر ضروری طور پر انگریزی کے لفظ گفتگو میں استعمال کر رہا ہوتا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ جب اُردو کا متبادل لفظ موجود ہے تو اُسے کیوں نہ استعمال کیا جائے۔
ایک مرتبہ اپنی ایک بہن کے ہاں گئے جن کے ہاں جدید تعلیم کا بہت زور تھا۔ کچھ دیر بعد اَبّا کو استنجے کی حاجت محسوس ہوئی تو اُن کی بھانجی نے جو میٹرک کی طالبہ تھی اُن سے دریافت کیا ''قاری ماموں کیا لیٹرین جارہے ہیں'' اَبّا نے مسکرا کر اُس بچی سے کہا ''نہیں بیٹا لیٹنے نہیں استنجا کرنے جارہا ہوں''۔

بچپن میں اَبّا کی طبیعت تعلیم کی طرف قطعی مائل نہیں تھی جس سے تمام اہل خانہ پریشان تھے۔ جب اَبّا رامپور کے مدرسۂ عالیہ سے بھی جان چھڑا کر پیلی بھیت واپس آگئے تو اُس وقت پیلی بھیت میں فوجی بھرتی کا کیمپ لگا ہوا تھا لہٰذا اُن کے پھوپھا منشی عبدالوحید خان نے اپنے بیٹوں اور ابا کو فوج میں بھرتی کرانے پر گھر کے افراد کو راضی کرلیا اور اَبّا کو لے کر کیمپ پر پہنچے۔ اَبّا کا انٹرویو کرنے والا ایک انگریز تھا۔ سرخ و سپید اَبّا نے اُس وقت تک کسی انگریز کو اتنے قریب سے دیکھا

نہیں تھا، اس لیے وہ بڑا مضحکہ خیز نظر آیا۔ چنانچہ اُس نے جیسے ہی اَبّا سے کچھ پوچھا تو اُس کی آواز اور ایک اجنبی زبان سن کر اَبّا ہنس دیئے۔ یہ بات انگریز کو ناگوار گزری۔ لہٰذا اُس نے نہایت درشت لہجے میں منشی عبدالوحید خان سے کہا "I don't like this attitude my dear" منشی عبدالوحید خان کی ڈانٹ پھٹکار سنتے ہوئے اَبّا واپس گھر آگئے مگر انگریز کا یہ جملہ اُن کے دماغ میں گونجتا رہا اور اُس جملے نے ایک عجیب وغریب مبہم جملے کی صورت اختیار کرلی۔ اَبّا کو جب کسی کی کوئی بات اچھی نہیں لگتی تھی تو نہایت تیزی سے کہتے تھے "I don't know it is dibri like with depong my dear" ایک مرتبہ بلدیہ کراچی کا ایک کلرک کسی کام کے عوض اَبّا سے رشوت طلب کرنے لگا۔ اَبّا نے جواباً اس سے نہایت تیزی سے یہ جملہ کہا تو وہ گھگیانے لگا اور بولا کسی سے ذکر نہ کیجئے گا۔ میں ابھی آپ کا کام کردیتا ہوں۔ یہ واقعہ سنا کر اَبّا خوب ہنسا کرتے تھے۔

مولوی اور شاعر

اپنی خود نوشت میں شاعروں اور مشاعروں کے حوالے سے بھی اَبّا نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''مجھے شعر وشاعری سے اُنس ہے۔ ایک زمانے میں شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی تھی اور کچھ لکھا بھی تھا لیکن جلد اندازہ ہوگیا کہ یہ نہ میرا میدان ہے اور نہ میں اپنے اندر شاعروں کے سے طور طریقے پیدا کرسکتا ہوں، اس لیے نثر لکھنے کی طرف توجہ دی اور اپنے موضوعات متعین کیے مگر اس کے باوجود اچھا شعر آج بھی طبیعت پر اثر کرتا ہے۔ جو شعر پسند آتا ہے اُسے لکھ بھی لیتا ہوں اور یاد بھی کرلیتا ہوں۔ کبھی کبھی دورانِ تقریر موقع محل کی مناسبت سے کوئی شعر

یاد آجائے تو پڑھ بھی دیتا ہوں۔ شعرا سے تعلقات بھی استوار ہوئے اور بعض شعراء دوست بھی ہوگئے، مگر ان کی صحبتوں میں وقت ضائع نہیں کیا۔ البتہ وہ شاعر مجھے زیادہ اچھے لگتے ہیں جن کی طبیعت میں حسِن مزاح موجود ہو۔ ۱۹۶۰ء میں ایک رات کسی وعظ کی محفل سے گھر لوٹ رہا تھا کہ صدر سے بس میں شاعروں کی ایک ٹولی سوار ہوئی۔ سب خوش پوش اور ہنستے بولتے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے پر فقرے کستے ہوئے۔ ان نوجوانوں کی انہی حرکات سے میں نے یقین کرلیا کہ یہ شاعر ہیں اور کسی مشاعرے سے آرہے ہیں۔ جب ان سے کنڈیکٹر نے ٹکٹ مانگا تو سب بغلیں جھانکنے لگے۔ آخر سب نے اپنے اپنے پیسے ملائے اور بڑی مشکل سے چھ ٹکٹ کی رقم پوری کی۔ میں نے اس کیفیت کو دیکھ کر ان سے کہا ''اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں بھی اس چندے میں شامل ہوجاؤں''۔ سب نے بیک آواز بسم اللہ کہا۔ میں نے جواباً عرض کیا ''بھائی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شاعروں اور مولویوں کی میت اکثر چندے سے ہی اُٹھتی ہے''۔

ابا نے اپنے سفر نامۂ حج ''مشاہداتِ حرمین'' میں معروف شاعر جگر مراد آبادی سے مسجد نبوی ﷺ میں ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن میں نے مسجد نبوی ﷺ کے صحن میں بعد نمازِ عصر تقریر کی اور دورانِ تقریر جگر مراد آبادی کا ایک شعر پڑھا۔

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں

تقریر ختم ہوئی تو ایک صاحب آکر بے اختیار میرے سینے سے لگ گئے۔ ابھی میں شناخت کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ برابر میں کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا ''جگر صاحب''۔ میں دنگ رہ گیا اور جگر صاحب زار وقطار روتے ہوئے فرمانے لگے ''بھائی آپ نے مسجد نبوی ﷺ میں ہمارا شعر پڑھ کر تو ہماری مغفرت کا سامان کر دیا''۔

طمانچہ کا جواب

مکافاتِ عمل پر اَبّا بہت یقین رکھتے تھے۔ اپنے ساتھ ہونے والی کسی بھی برائی کا سبب ضرور تلاش کرتے اور فرماتے اللہ تعالیٰ بلا سبب اپنے بندوں پر سختی نہیں اتارتا۔ ایسا وہ اس لیے کرتا ہے کہ بندہ اپنی ذات سے دوسروں کے لیے آزار نہ پیدا کرے اور اپنی حدود کو پہنچانے۔ اس حوالے سے ابا نے اپنی خودنوشت میں ایک بڑا سبق آموز واقعہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''جب بھی وہ دن یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور ندامت محسوس کرنے لگتا ہوں۔ ہوا یہ کہ تقریباً بیس برس کی عمر تھی۔ جوانی کا نشہ ہمیں جانتے ہیں کہ کیسا تھا۔ والد صاحب کلکتہ سے لکھنؤ آرہے تھے۔ طبیعت شدید ناساز تھی۔ ریل کے انٹر کلاس کی پوری سیٹ پر وہ لیٹے ہوئے تھے اور میں اُوپر کی برتھ پر لیٹا ہوا تھا۔ بنارس کے اسٹیشن پر ایک صاحب ڈبہ میں داخل ہوئے اور والد صاحب کا پیر ہلا کر کہا۔ ''اٹھ کر بیٹھو۔ یہ لیٹنے کی جگہ نہیں ہے''۔ مجھے مسافر کی یہ حرکت سخت ناگوار ہوئی۔ نیچے اترا اور اترتے ہی اُس شخص کے منہ پر اس زور سے طمانچہ رسید کیا کہ پورا ڈبہ گونج اٹھا۔ والد صاحب باوجود بیمار اور کمزور ہونے کے جلدی سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے اور میرے اوپر سخت ناراض ہوئے۔ میں نے جن صاحب کے طمانچہ مارا تھا وہ مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ حافظِ قرآن تھے اور روزے سے تھے وہ سہم کر رہ گئے اور کہنے لگے ''کبھی ہم بھی جوان تھے، مگر ایسے نہیں کہ رمضان میں ایک روزہ دار پر ہاتھ اٹھائیں'' تھوڑی دیر تک تو ہمارے جوش اور غصہ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ والد صاحب نے ہمیں برا بھلا بھی کہا، مارا بھی اور حافظ صاحب سے معافی بھی منگوائی۔ بات ختم ہوگئی مگر طمانچہ کا جواب طمانچہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ ریل گاڑی بنارس سے لکھنؤ پہنچ گئی۔ رات کو دس بجے پیلی بھیت کے

لیے ہم دوسری گاڑی میں سوار ہوئے۔ صبح چار بجے میلانی کے اسٹیشن پر نیپالی علاقے کے پہاڑیوں نے ڈبہ میں داخل ہونا شروع کیا۔ میں نے روکنے کی کوشش کی تو ایک پہاڑی نے جس کے گلے میں پستول لٹک رہا تھا، میرے منہ پر اس زور سے طمانچہ رسید کیا کہ میں چکرا کر گر پڑا۔ ممکن ہے کہ وہ اور بھی مارتا مگر مسافروں کے بیچ میں آنے کی وجہ سے بچ گیا۔ معاملہ چونکہ سیر پر سوا سیر کا تھا لہٰذا میں خاموش بیٹھ گیا۔ والد صاحب نے مجھ سے فرمایا ''یہ ہے اُس طمانچہ کا جواب جو تم نے معمولی سی بات پر ایک حافظ اور روزے دار کے منہ پر مارا تھا''۔

اس نوعیت کے متعدد واقعات اپنے اور دوسروں کے حوالے سے اَبّا نے اپنی ڈائریوں میں درج کیے ہیں۔ یہ واقعات بلاشبہ بڑے سبق آموز ہیں۔

حرفِ ندامت

۱۴رمئی ۲۰۰۱ء کو اَبّا کی ۲۵ ویں برسی کے موقع پر میں نے اپنی ڈائری میں اَبّا کے حوالے سے کچھ یادداشتیں تحریر کی تھیں۔ آج میں ان یادداشتوں کو پڑھ رہا ہوں تو جہاں ضبطِ گریہ کے باوجود آنکھیں اپنا کام کررہی ہیں، وہاں اپنی نافرمانیوں پر دل بوجھل ہے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر تک میں اَبّا کی توجہ کا مرکز رہا۔ اُن کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ میری اعلیٰ خطوط پر تربیت کریں لیکن یہ میری بدقسمتی کہ میں نے ایک عمر تک اَبّا کی صحبتوں اور نصیحتوں کو درخور اعتنا تصور نہ کیا اور خرافات میں روز و شب بسر کرتا رہا۔ جب ذرا ہوش آیا تو روزگار کی مصروفیات اور ادبی سرگرمیاں شروع ہوچکی تھیں جن میں اَبّا کے مشوروں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ رات کو بہت تاخیر سے گھر میں داخل ہونا اور صبح تاخیر سے سوکر اٹھنا میرا معمول تھا۔ کچھ عرصہ تک تو اَبّا

نے اس معمول کے خلاف مزاحمت کی لیکن پھر شاید انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے
جس کا مجھ کو یہ نقصان پہنچا کہ میں اُن سے مزید دُور ہوتا چلا گیا۔ افسانہ نگار بننے
کے جنوں میں فحش نگاری کی سمت نکل گیا اور اپنی تحریریں اَبّا سے چھپانے لگا۔ ایک
مرتبہ ایک رسالہ میں شایع شدہ میرا افسانہ اَبّا نے پڑھ لیا۔ یقیناً وہ ایسا نہیں تھا جس
پر اَبّا خوش ہوتے لہٰذا انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ ایسی تحریریں ہونا چاہئیں جن کو گھر
کے افراد بھی پڑھ کر خوش ہوسکیں۔ میں شرمندہ ضرور ہوا مگر اپنے عمل پر قائم رہا۔
۱۹۷۱ء میں میری طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو از سرِ نو میری اَبّا سے ذہنی قربت میں
اضافہ ہوا اور یہ قربت ۱۹۷۶ء میں اُن کے انتقال تک برقرار رہی۔ آج اَبّا کے
حوالے سے سوچتا ہوں تو بڑی ندامت ہوتی ہے کہ میں اُن سے کوئی علمی یا روحانی
استفادہ نہ کرسکا۔ عربی، فارسی اور اُردو زبان پر اُن کو دسترس حاصل تھی لیکن میں نے
کبھی اُن کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج میں عربی و
فارسی زبان سے تقریباً نابلد ہوں۔ شاعری کی وجہ سے فارسی لفظیات و تراکیب کا
معمولی فہم پیدا ہوگیا ہے، مگر ذرا ذرا سی بات کے لیے دوسروں سے رجوع کرتا
ہوں۔ البتہ اس صورتحال کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ آج بھی طالب علم ہوں اور جو
کچھ آتا ہے اُس کے حوالے سے کسی تفاخر کا شکار نہیں۔ اَبّا کی خوبی یہ تھی کہ اُن کو
سب کچھ آتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کسی ہنر پر نازاں نہیں تھے۔ ہمہ وقت
عجز و انکسار کا اظہار کرتے تھے۔ علم کے حوالے سے بھی اور نسب کے حوالے سے
بھی۔ حالانکہ وہ نسبی طور پر بڑی مضبوط پشت کے آدمی تھے۔ آج میں دیکھتا ہوں کہ
لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی نسبتوں پر نازاں رہتے ہیں مگر اَبّا کی سی بزرگی اور اعلیٰ ظرفی
مجھے کسی میں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ مفتخر اور جاہ پسند علماء و مشائخ سے وہ سخت تنفر کا

اظہار کرتے مگر درویش صفت افراد کی جوتیاں سیدھی کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ آج
جو میں اپنے بزرگوں کے مسلک پر کاربند ہوں وہ اَبّا کے ہی فیضِ تربیت کا نتیجہ
ہے۔ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ ہمیشہ اپنے عقیدہ پر قائم رہنا اور عقیدت سے گریز
کرنا۔ مسلک کے حوالے سے نفس پرست علما و مشائخ کی عقیدت کا جب حصار ٹوٹتا
ہے تو آدمی عقیدے سے بھی متنفر ہوجاتا ہے۔ اس لیے عقیدت کے معاملے میں محتاط
رہنا چاہیے۔ ادب شرطِ انسانیت ہے لہٰذا ادب کو کبھی ترک نہیں کرنا۔ عقیدت بغیر
ادب کے مکمل نہیں ہوتی لیکن ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق ادب سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس
حوالے سے میں اَبّا کی نصیحت پر کاربند تو ہوں لیکن نفس کا غلام ہوں اس لیے
عقیدت سے اجتناب میں دریدہ دہنی اور یاوہ گوئی کا شکار ہوجاتا ہوں۔ عموماً درگزر
اور احتیاط مزاج سے رخصت ہوجاتی ہے یہی وہ عیب ہے جو مجھ میں کسی خوبی کو
پروان چڑھنے نہیں دیتا۔

تصنیف و تالیف سے شغف

اگرچہ مضمون نویسی کی جانب اَبّا اپنے قیام دہلی کے دوران ہی راغب ہوگئے
تھے لیکن اس میں کوئی باقاعدگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ شاید اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ
دہلی سے پیلی بھیت واپس آنے کے بعد جہاں حصولِ معاش کی جدوجہد کا آغاز ہوگیا
تھا وہاں اَبّا کی سیاسی زندگی بھی شروع ہوگئی تھی۔ مطالبۂ پاکستان کی منظوری کے لیے
جلسے جلوسوں میں شرکت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مضمون نویسی کے لیے کوئی وقت ہی باقی
نہیں رہا۔ مگر اس کے باوجود پیلی بھیت سے نکلنے والے ایک ہفت روزہ ''نوجوان'' میں

"جہاد"، "اتحاد"، اور "امت کی پکار" کے عنوان سے مضامین شایع ہوئے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر عبدالشکور تھے۔ پھر قیامِ پاکستان کے بعد ایک نئی زندگی آغاز ہوئی اور اس نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اُن کو ہمہ تن جدوجہد شروع کرنا پڑی لیکن حالات کی ناہمواری اور آبائی کتب خانے سے محرومی کے باوجود انہوں نے ۱۹۴۹ء میں قرطاس وقلم سے اپنی وابستگی کو ازسرِ نو استوار کرلیا۔ اَبّا کی مطبوعات کے ذخیرے میں چند مضامین ایسے موجود ہیں جو انہوں نے ۱۹۴۹ء میں لکھے تھے اور یہ تمام مضامین روزنامہ جنگ کراچی اور ماہنامہ الاسلام کراچی میں شایع ہوئے تھے۔ بعض مضامین ان میں بڑے اہم ہیں اور مضامین کے متن اور عنوانات سے اَبّا کی مذہب اسلام کے حوالے سے معلومات اور جدید سوچ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ امام ابویوسفؒ کی اقتصادی اور تمدنی اصلاحات، مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی، ۱۵/اگست ۱۹۴۹ء۔

۲۔ اسلامی عدالتوں کی ایک جھلک، روزنامہ جنگ کراچی، ۱۷/ستمبر ۱۹۴۹ء۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خطابت اور فصاحت، ماہنامہ الاسلام کراچی، ذیقعد ۱۳۶۹ھ۔

۴۔ اسلام کا نظام انتخاب وعدالت، ماہنامہ الاسلام کراچی، جمادی الثانی، ۱۳۶۹ھ

۵۔ اسلام میں طبقاتی جنگ کے پہلے علمبردار حضرت ابوذر غفاریؓ، ماہنامہ الاسلام کراچی، جمادی الاوّل ۱۳۶۹ھ

۶۔ اسلام کا نظام صنعت وتجارت، ماہنامہ الاسلام کراچی، رجب المرجب ۱۳۶۹ھ

۷۔ اسلامی خصوصیات کی ایک جھلک، ماہنامہ الاسلام کراچی، ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ

۸۔ روزہ: نفس اور روح کا محافظ، ماہنامہ الاسلام کراچی، رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ

۹۔ اسلام اور اخلاق، ماہنامہ الاسلام کراچی، شوال المکرم ۱۳۶۹ھ

۱۰۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک، ماہنامہ الاسلام کراچی، محرم الحرام ۱۹۶۹ھ۔ اس مضمون کی چار اقساط شائع ہوئیں۔

مضمون نویسی کی اسی صلاحیت کی بنا پر انہوں نے ۵۴-۱۹۵۳ء میں اپنا سفرنامۂ حج لکھا اور اس کے بعد تصنیف و تالیف کے دروازے اُن پر کھلتے چلے گئے۔ میں یہاں کسی تفصیل میں جائے بغیر مختصراً اَبّا کی تصانیف کا تعارف تحریر کررہا ہوں۔

مشاہداتِ حرمین:

یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو کراچی سے شائع ہوئی۔ بقول مولانا عبدالحامد بدایونی "قیامِ پاکستان کے بعد یہ پہلا سفرنامۂ حج ہے اور ایک زائر حرم اور عاشقِ بارگاہِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محض خیالات، محسوسات اور مشاہدات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ یہ حضرات صحابہؓ، حضرات اہلبیتؓ و ازواج مطہراتؓ اور حرمین شریفین کے تاریخی حالات، متبرک مقامات، مساجد و مقابر اور سماجی و اقتصادی حالات کا بھی مظہر ہے"۔

رحمتِ دوعالم ﷺ:

یہ کتاب ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو نہایت جامع اور مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یکم شعبان ۱۳۷۳ھ کو مطبعِ سعیدی کراچی سے شائع ہوئی۔

حیاتِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ:

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زندگی اور کارناموں کو بے حد دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے مگر معلومات سے بھرپور ہے۔ یکم جولائی ۱۹۵۵ء کو مطبعِ سعیدی کراچی سے شایع ہوئی۔

تاریخِ اسلام کامل:

قران محل کراچی سے یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شایع ہوئی تھی۔ ۷۵۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب وہ پہلی تاریخ تھی جس کے چودہ ابواب ہیں اور ہر باب اپنے دور کی مفصل و مستند تاریخ تھا۔ کتاب میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر ۱۹۵۸ء تک کے واقعات کو جدید ترتیب اور سلیس زبان میں تحریر کیا گیا تھا۔ جس وقت یہ کتاب شایع ہوئی اِسے تاریخ اسلام پر ایک اہم ترین کتاب تسلیم کیا گیا تھا۔

مختلف موضوعات پر کتابچے

اسلامی تعلیمات پر مبنی علیحدہ علیحدہ پانچ کتابچے ۱۳۷۹ھ میں قران محل سے شایع ہوئے۔ ان کے عنوانات تھے۔ کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الایمان، کتاب الجہاد، کتاب الطہارت۔ تمام کتابچے ۶۴، ۶۴ صفحات پر مشتمل تھے۔

لُغات الفرقان:

قرآن مجید کے آٹھ ہزار سے زائد الفاظ پر مبنی ایک جامع لغت جس کی ترتیب بطرزِ انگریزی لغت تھی۔ اس میں ہر لفظ کے معنی مع تشریح و حوالہ پارہ اور رکوع درج

کیا گیا تھا۔ شروع میں ایک مبسوط مقدمہ تھا جس میں قرآن حکیم کے نزول کی تاریخ اور لغت کی اہمیت پر تفصیلی گفتگو کی گئی تھی۔ یہ لغت ۵۹۲ صفحات پر مشتمل تھی اور مطبع سعیدی کراچی سے ۱۹۶۱ء کو شایع ہوئی تھی۔

تاریخِ مسلمانانِ عالم:

۱۹۶۱ء میں ہی اَبّا نے ''تاریخ مسلمانان عالم'' کے عنوان سے ایک سلسلہ کتب کی تصنیف کا آغاز کیا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب تاریخ انبیاء تھی۔

تاریخِ انبیا:

حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام کے حالاتِ زندگی اور حیاتِ طیبہ کا ایک بے نظیر مجموعہ جس کی تصنیف میں معروف مسلم مورّخ علامہ ابنِ خلدون کی تاریخ سے بھرپور استفادہ کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ۵۱۲ صفحات پر مشتمل تھی اور ۱۹۶۲ء میں قران محل کراچی سے طبع ہوئی۔

تاریخ مصطفیٰ ﷺ:

نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت مبارکہ پر ایک نہایت جامع کتاب جس میں حدیث شریف اور مستند تواریخ کے حوالے سے تمام حالات و واقعات کو قلمبند کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ''تاریخ مسلمانان عالم'' کے سلسلے کی دوسری جلد تھی جو ۶۲۴ صفحات پر مشتمل تھی اور ۱۹۶۳ء میں قران محل کراچی سے طبع ہوئی تھی۔

تاریخ خلفائے راشدینؓ:

یہ کتاب خلفائے راشدین کی سیرت و خدمات پر ایک جامع و مستند کتاب تھی جس میں خلفائے اربعہ کے تیس سالہ دور کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات کا تفصیلی جائزہ موجود تھا۔ یہ کتاب ''تاریخِ مسلمانانِ عالم'' کے سلسلہ کی تیسری جلد تھی جو ۵۹۲ صفحات پر مشتمل تھی اور ۱۹۶۵ء میں قران محل کراچی سے شایع ہوئی تھی۔

تاریخ بنو امیّہ:

اس کتاب میں بنو امیّہ کے تمام خلفاء کی سیاسی زندگی اور کارناموں کو مستند تاریخی حوالوں کی روشنی میں قلمبند کیا گیا تھا۔ ۴۸۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں قران محل کراچی سے طبع ہوئی تھی اور ''تاریخِ مسلمانانِ عالم'' کی چوتھی جلد تھی۔

تاریخ بنو اُمیّہ کی تصنیف کے بعد ''تاریخ بنو عباس'' اور ''تاریخ بنو فاطمی'' پر کام جاری تھا کہ اَبّا کو امین برادرس ناشران و تاجران کتب کی طرف سے برصغیر کے معروف اولیائے کرام کی سوانح عمریاں لکھنے کی پیشکش ہوئی اور اَبّا نے اُن کے لیے تصنیف و تالیف کا آغاز کردیا جس کی بنا پر ''تاریخِ مسلمانانِ عالم'' پانچویں اور چھٹی جلد التوا کا شکار ہوگئی۔

داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ:

یہ کتاب حضرت سیّد علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوریؒ کی مفصل اور مکمل سوانح حیات اور اُن کے عظیم روحانی کارناموں پر مشتمل ہے۔ حضرت شاہ مانا میاں قادری چشتی پیلی بھیتی کا کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں

تصوف کی تاریخی حیثیت و اہمیت کو حضرت داتا گنج بخشؒ کی خدمات کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بڑی تختی کے ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۶۸ء میں امین برادرس کراچی نے اس کا پہلا ایڈیشن شایع کیا تھا۔ بعد میں اس کتاب کے لاہور اور کراچی سے بھی ایڈیشن طبع ہوئے۔

نامور اصحاب رسول ﷺ:

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامور اصحاب کا تذکرہ موجود ہے۔ کتاب میں مراجع و ماخذ بھی درج کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بڑی تختی کے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۶۸ء میں امین برادرس کراچی سے طبع ہوئی تھی۔

حضرت مخدوم صابر کلیریؒ:

یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں امین برادرس کراچی نے بڑی تختی کے ۱۶۰ صفحات پر شایع کی۔ حضرت خواجہ مخدوم علاء الدین صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات سے متعلق تمام واقعات اس کتاب میں مستند حوالوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

تاریخ ہندو پاک:

عظیم سپہ سالار محمد بن قاسم کی ہندوستان آمد سے لیکر ۱۹۷۴ء تک کے سیاسی اور تاریخی تغیرات پر مبنی ایک اہم کتاب جو ۴۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جسے ہندوستان کی قدیم اور جدید تاریخ پر ایک مستند کتاب کہا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں قران محل کراچی سے طبع ہوئی۔

صحیح بخاری شریف، مترجم اُردو:

اشاعتی ادارہ قران محل نے ۱۹۶۳ء میں علماء پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا تاکہ وہ ''صحیح بخاری شریف'' کا سلیس اور عام فہم اُردو زبان میں ترجمہ کرے۔ اس بورڈ میں مولانا امجد العلی رامپوری، مولانا سبحان محمود، مولانا ابوالفتح اور مولانا قاری احمد شامل تھے۔ بورڈ نے کئی سال کی محنتِ شاقہ کے بعد بخاری شریف کی ۷۲۷۵ احادیث نبوی ﷺ کا ترجمہ مکمل کرکے چار ضخیم جلدوں میں مدون کیا۔ مذکورہ چاروں جلدیں نہایت خوبصورت انداز میں ''قران محل'' کراچی سے شایع کی گئیں۔

مسندِ امام اعظمؒ، مترجم اُردو:

یہ کتاب ۵۲۳ احادیث نبوی ﷺ پر مشتمل حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایمان افروز صحیفہ کا عربی متن کے ساتھ بامحاورہ سلیس ترجمہ ہے۔ شروع میں حضرت امام ابوحنیفہ کی حیات و خدمات پر ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ بعد میں بطور مضمون کئی رسالوں میں شایع ہوا۔ جون ۲۰۱۲ء میں اس مضمون کو دیگر تین اماموں کے حالات کے ساتھ ''چار امام'' کے عنوان سے مکتبۂ علیمیہ کراچی نے ۸۰ صفحات پر مشتمل ایک کتابچے کی صورت میں بھی شایع کیا جس میں پروفیسر محمد آصف علیمی اور یوسف طرب شمسی پیلی بھیتی کے مصنف کے سوانحی اور علمی کارناموں پر مضامین بھی شامل ہیں۔

اسماء الرجال:

راویانِ احادیثِ نبوی ﷺ کے جامع و مستند حالات پر مبنی کتاب کا اُردو ترجمہ۔ جسے قران محل سے شایع ہونے والی مشکوٰۃ شریف میں آخری جز کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔

اَبّا نے کئی کتابوں پر مبسوط مقدمے بھی تحریر کیے جن میں ابنِ تیمیہؒ کی کتاب ''سیاست شرعیہ'' کا اُردو ترجمہ، امام ابن جزریؒ کی کتاب ''حصنِ حصین'' کا اُردو ترجمہ، مولانا امجد العلی کی کتاب ''اصول حدیث'' اور محمد عطاء اللہ خان کی ''مجالس المومنین'' شامل ہیں۔ یہ کتابیں کلام کمپنی اور ''قران محل'' کراچی سے طبع ہوئی تھیں۔

اس کے علاوہ اَبّا نے ماہنامہ پیام حق کی ادارت کے دوران مختلف مذہبی، سیاسی، تاریخی موضوعات پر تقریباً ایک ہزار مضامین قلمبند کیے جو ''پیامِ حق'' میں ہر ماہ ۲۳ سال تک شایع ہوتے رہے۔ اَبّا پابندی سے روزنامچہ بھی لکھا کرتے تھے۔ ان روزنامچوں پر مشتمل تقریباً بیس ڈائریاں بھی اَبّا کے ذخیرے میں موجود ہیں۔

علالت اور انتقال

اَبّا کے انتقال کی تقریباً تمام اخبارات و رسائل میں خبریں شایع ہوئیں، اَبّا تو ایسے معروف شخص نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے حلقۂ احباب کو محدود رکھا لیکن میں اُس زمانے میں صحافی تھا اس لیے یہ خبریں میرے حوالے سے شایع ہوئیں۔ ان خبروں میں کہا گیا تھا کہ خواجہ رضی حیدر کے والد انتقال کرگئے۔ یہ بات میرے لیے دکھ کی تھی کہ جس شخص نے میری شناخت کو واضح کرنے کے لیے تمام عمر کوشش کی آج اُس کے انتقال کی خبر میرے حوالے سے شایع ہوئی ہے۔ بعد میں تعزیتی بیانات میں بھی میرا حوالہ آتا رہا اور کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ یہ ایک عالم

اور مورخ کی موت ہے۔ علماء اور کسی علمی حلقہ کی جانب سے نہ کوئی تعزیتی بیان آیا نہ کسی نے کوئی مضمون تحریر کیا۔ گولڑہ شریف کے حوالے سے صرف مولانا شاہ حسین گردیزی نے ایک مضمون تحریر کیا جو روزنامہ جنگ میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے لکھا کہ ''ممتاز عالم دین اور مورخ اسلام مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی نہایت گوشہ نشینی اور گمنامی کی زندگی گزارنے کے بعد اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی سمت کوچ کرگئے۔ مولانا کی تمام زندگی فقہ اور تاریخ کی خدمت میں گزری اور وہ بھی اس انداز سے کہ نہ ستائش کی تمنا کی اور نہ کبھی صلہ کی پرواہ۔ نہایت خاموشی کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہے، یہی وجہ ہے کہ فقہ اور اسلامی تاریخ جیسے اہم موضوعات پر بائیس (۲۲) سے زائد کتب تصنیف کرنے اور بیس سال سے زائد ایک علمی رسالہ کی ادارت کا فریضہ انجام دینے کے بعد بھی اُن کی شناسائی چند افراد تک محدود رہی۔ اُن کے انتقال پر اخبارات میں شایع ہونے والی خبروں سے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو یہ علم ہوا کہ مولانا تصنیف و تالیف سے بھی شغف رکھتے تھے۔ دراصل یہ مولانا کی اعلیٰ ظرفی اور حصولِ شہرت سے عدم دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے کبھی اپنی استعدادِ علمی اور معلومات وافرہ کے اظہار و نمائش کی ضرورت اور تعارف کو محسوس نہیں کیا''۔

اَبّا کے انتقال پر جہاں رشتہ داروں اور عزیزوں کے خطوط موصول ہوئے وہاں میرے اور اَبّا کے احباب نے بھی مجھ سے اظہارِ تعزیت کیا۔ حضرت شاہ مانا میاں قادری چشتی پیلی بھیتی نے بہت رنج افزاء خط لکھا۔ اَبّا کے پھوپھی زاد بھائی حسن میاں صاحب نے رامپور سے خط لکھا۔ کانپور سے مولانا احمد حسن کانپوری کے نبیرہ قاری شبیر احسن نے، آگرہ سے پروفیسر معین فریدی نے، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر

مغیث الدین فریدی نے کوئٹہ سے اَبّا کی خالہ زاد بہن گپن پھوپھی نے بہت درد انگیز تعزیت کی۔ احباب میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری، مولانا مفتی جمیل احمد نعیمی، آزاد بن حیدر ایڈوکیٹ، خانزادہ سمیع الوری، ڈاکٹر نظر کامرانی، جناب واحد رشیدی نے بذریعۂ خط اظہارِ تعزیت کیا۔ میرے دوست اور ممتاز صحافی پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ اظہارِ تعزیت کے لیے گھر تشریف لائے مگر مجھ سے ملاقات نہ ہوسکی لہٰذا میرے نام ایک تحریر چھوڑ گئے جس میں انہوں نے لکھا تھا ''میں حاضر ہوا۔ آپ سے ملاقات نہیں ہو پائی۔ آپ کے صدمہ کی اطلاع مجھے کل عظیم سرور صاحب کی زبانی ملی۔ انہوں نے بتایا کہ اخبار میں اطلاع آئی تھی مگر افسوس مجھے خبر نہ ہوئی۔ گھر جا کر پرانے اخبار دیکھے تو ''روزنامہ ڈان'' میں خبر مل گئی۔ کتنے شرم کی بات ہے میرے لیے کہ دس روز بعد حاضر ہوسکا۔ میری دلی تعزیت قبول کیجئے۔ والدہ اور تمام بھائی بہنوں سے بھی۔ خدا آپ سب کو صبر دے اور آپ کو آنے والے وقت کی بڑی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی ہمت دے۔ آپ کا حوصلہ آپ کے متعلقین کے حوصلہ کی بنیاد ہوگا''۔ اسی طرح اَبّا کے قرابت دار معروف نقاد و شاعر سلیم احمد کے چھوٹے بھائی پروفیسر شمیم احمد نے جو اُن دنوں بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے اَبّا کے انتقال کی اطلاع ملنے پر مجھ کو ۳ر جولائی ۱۹۷۶ء کو ایک تعزیتی خط ارسال کیا۔ انہوں نے لکھا تھا ''عزیزی رضی! بہت دعائیں۔ آج ہی تمہارے خط سے قاری بھائی کے انتقال کی خبر معلوم کرکے سخت صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں مع سب اعزہ کے اِس سانحہ جانکاہ کو برداشت کرنے کی ہمت بخشے۔ آمین۔ یہ غم ایسا ہوتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے اور کن الفاظ میں اِس نعمت کی محرومی پر صبر کی تلقین کی جائے جو زندگی کی سب سے بیش بہا دولت کہی

جاسکتی ہے۔ باپ کی شفقت سے محرومی کا اندازہ میں نہیں کرسکتا، کیونکہ مجھے باپ کے سائے سے اُس وقت محروم ہونا پڑا جب میں تین سال کا تھا، لیکن اِس محرومی نے زندگی کی تشنگی کو جس جس طرح ہماری روح میں گھولا ہے اُس کی اذیت ناقابلِ اظہار ہے۔ تم خوش نصیب تھے کہ تمہیں اتنی عمر اِس عظیم نعمت کی خدمت میں گزارنے کا موقع ملا اور اب تم سوائے اُن کی روح کو ثواب پہنچانے کے اور کیا کرسکتے ہو۔ اللہ تمہیں اس کی توفیق دے۔ مجھے بہت دُور نہ جانو اگر اپنا سمجھتے ہو۔ اللہ تمہیں اور تمہارے اعزہ کو صبر ارزاں کرے۔ تمہارا شمیم بھائی''۔ اللہ تعالیٰ تمام تعزیت گزاروں سے رحم کا معاملہ فرمائے۔ آمین۔

اَبّا دراز قد، چوڑے اور نہایت وجیہہ انسان تھے۔ ہر شخص اُن کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتا تھا، تقریباً پچاس سال مگدر گھمائے اور ورزش کی جس کی بنا پر صحت قابلِ رشک تھی لیکن عمر کی آخری دہائی میں اپنی صحت کی طرف سے غافل رہنے لگے، ہمہ وقت اپنی سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور حقوق العباد کی احسن طریقے پر ادائیگی کی فکر نے اُن کو اپنی جانب دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی، بظاہر چاق و چوبند تھے لیکن اندر اندر گھلتے چلے گئے، ساٹھ سال کی عمر میں ہرنیا کی شکایت ہوگئی جس کا خود ہی علاج کرتے رہے۔ فشارِ خون اور ذیابیطس وغیرہ کے کبھی مریض نہیں رہے اور اگر ہوں گے تو اہلِ خانہ اور خصوصاً مجھ کو کبھی مطلع نہیں کیا البتہ ۱۹۷۳ء میں میری بہن شاہدہ کی شادی کے موقع پر میں نے اُن کے پیروں پر ضرورت سے زیادہ سوجن دیکھی تو دریافت کیا مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مصروفیت کی بنا پر ہے لیکن بعد میں اُن کے اٹھنے بیٹھنے سے نقاہت ظاہر ہونے لگی، اگرچہ وہ اس عالم میں بھی میلوں پیدل چلتے تھے اور کہتے تھے کہ پیدل چلنے سے تمام عوارض سے نجات ملتی

ہے۔ اس کے باوجود اُن کی صحت جواب دینے لگی تھی۔ ۲/اپریل ۱۹۷۶ء بروز جمعہ اَبّا نے حسبِ معمول رحمت مسجد بھیم پورہ میں نماز جمعہ سے قبل تقریر کی اور حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کے حالات بیان فرمائے۔ نماز بعد اپنے بلوچ دوست مرزا خان کے ساتھ نادری ہوٹل لی مارکیٹ کھانا کھایا۔ پھر میٹھادر گاڑگلی میں واقع اپنے مطب گئے۔ رات کو وہاں سے فارغ ہوکر بس میں سوار ہونے کے لیے لی مارکیٹ آرہے تھے کہ سڑک پار کرتے ہوئے دل میں شدید درد محسوس ہوا۔ فوراً فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے اور پھر بے ہوش ہوگئے۔ بیس منٹ بعد ہوش آیا تو چاروں طرف لوگ جمع تھے جن میں کچھ اَبّا کے شناسا بھی تھے۔ ہوش آنے پر اَبّا نے لوگوں سے کہا ٹیکسی میں بٹھادو گھر پہنچ جاؤں گا۔

دوسرے دن ناظم آباد کے ارشد کلینک میں ڈاکٹر قمر الدین صدیقی کو دکھایا جنہوں نے انجائنا تشخیص کیا اور مکمل آرام کی ہدایت کی۔ بارہ بجے دن اَبّا کی ایک بہن کے لڑکے نے آکر اطلاع دی کہ اُن کی خالہ زاد بہن یسریٰ کے شوہر کا حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا ہے۔ یہ خبر اُن کے لیے شدید صدمے کا باعث تھی۔ یسریٰ پھوپھی کا نکاح بھی اَبّا نے پڑھایا تھا، لہٰذا شام کو اپنے چھوٹے داماد صادق حسین اور چھوٹے بیٹے ولی حیدر کے ساتھ یسریٰ پھوپھی کے گھر گئے وہاں سے رات کو رحمت مسجد میں حسبِ وعدہ تقریر کو پہنچے اور رات گئے گھر واپس آئے۔ دودن بعد صبح دانت مانجتے ہوئے اچانک طبیعت بگڑ گئی اور بے ہوش ہوگئے۔ بے ہوشی تقریباً دس منٹ برقرار رہی۔ چہرے پر نقاہت نمایاں ہوگئی اور شدید پسینہ آیا۔ اسی شام میں نے اپنے دوست نصیر ترابی کو ٹیلی فون پر اطلاع دی اور میں اُن کے ساتھ اَبّا کو لیکر ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر شوکت سیّد کے کلینک گیا۔ ڈاکٹر سبد نے

معائنہ کے بعد جناح کارڈیو ویسکلر میں داخل کرانے کا مشورہ دیا۔ اَبّا اسپتال میں داخل نہیں ہونا چاہتے تھے کہتے تھے بچوں کے درمیان جلد صحت بحال ہوگی مگر مجبوری تھی۔ اسپتال میں جب نرس کولھے پر انجکشن لگانے کے لیے آئی تو پریشان ہوگئے۔ پوچھنے لگے کوئی کمپونڈر نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا اس کی ڈیوٹی ہے تو مجھ سے کہا ''خیر۔ میری ستر کی حفاظت کرنا۔ غیر عورت کی نگاہ نہ پڑے''۔

اَبّا تقریباً چودہ دن اسپتال میں رہے۔ دن میں امّاں اور بچے پاس ہوتے تھے اور رات کو دفتر سے فارغ ہوکر میں پہنچ جاتا تھا۔ ایک دن میں پہنچا تو نرس نے اطلاع دی کہ آپ کا ٹیلی فون آیا ہوا ہے۔ میں کاؤنٹر پر پہنچا تو دوسری طرف سے پروفیسر شریف المجاہد بول رہے تھے۔ انہوں نے پہلے تو اَبّا کی علالت پر افسوس ظاہر کیا اور پھر اطلاع دی کہ اُن کو قائد اعظم اکادمی کا ڈائریکٹر نامزد کردیا گیا ہے۔ والد صحت مند ہوجائیں تو آیئے گا۔ انہوں نے مجھ سے قائد اعظم کے حوالے سے زیرتحریر میری کتاب کے بارے میں بھی دریافت کیا اور کہا کہ ''اس کام کو دسمبر ۱۹۷۶ء سے قبل مکمل کرلیں تاکہ اسے قائد اعظم کے صد سالہ جشن پیدائش پر اسلام آباد میں ہونے والی انٹرنیشنل کانگریس کے مندوبین میں تقسیم کیا جاسکے''۔ ٹیلی فون سن کر جب میں اَبّا کے پاس آیا تو انہوں نے دریافت کیا کس کا ٹیلی فون تھا۔ میں نے تفصیل بتائی تو بہت خوش ہوئے اور دعائیہ انداز میں کہا ''پروفیسر صاحب سے اپنا تعلق برقرار رکھنا۔ اللہ نے چاہا تو ان کی ذات سے تم کو علمی فوائد حاصل ہوں گے''۔ اَبّا کی یہ دعا قبول ہوئی اور بعد میں پروفیسر شریف المجاہد کے ایما پر میں نے نہ صرف قائد اعظم اکادمی سے وابستگی اختیار کی بلکہ مجاہد صاحب نے میری علمی تربیت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

اَبّا بڑے راست فکر انسان تھے۔ ہنگامہ خیز لمحات میں بھی غیر جذباتی رویہ اختیار کرتے تھے۔ اُن کا ذہن ہمیشہ خیر کی طرف جاتا تھا۔ ہر اک کو دعا دینا اُن کا معمول تھا۔ خاص طور پر بچوں اور مریضوں کو بہت دعا دیا کرتے تھے۔ ایک رات جب میں اسپتال پہنچا تو دیکھا کہ اَبّا بستر پر نماز پڑھ کر دعا کررہے تھے۔ چہرے پر عاجزی نمایاں تھی۔ میں نے دریافت کیا تو فرمانے لگے ''برابر کے بستر پر جو مریض آیا ہے اُس کی حالت نازک ہے۔ دعا کررہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے صحت دے۔ پھر مجھ سے فرمایا اس شخص کے دل میں بیٹری نصب کی گئی ہے۔ پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں۔ اگر کسی مرحلے پر ڈاکٹر میرے لیے کوئی ایسا مشورہ دیں تو اُس پر عمل نہ کرنا۔ موت اور زیست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بیٹری متعینہ عمر میں اضافہ تھوڑی کرسکتی ہے۔ میں نے محنت سے جو کچھ کمایا اور بچایا ہے وہ میرا نہیں میرے بچوں کا ہے۔ اُسے میری ذات پر مت لگانا۔ ابھی تم کو بڑی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے''۔

آخری لمحات

گھر پہنچ کر اَبّا کی طبیعت مسلسل بہتر ہورہی تھی۔ مطب جانے کے علاوہ گھر پر اپنے لکھنے پڑھنے کے تمام کام وہ حسب معمول کرنے لگے تھے۔ ۱۴رمئی ۱۹۷۶ء کو صبح جب میں سوکر اٹھا تو اَبّا اخبار پڑھ رہے تھے۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر جب میں اَبّا کے پاس آیا تو انہوں نے مجھے اخبار میں قتل کی ایک خبر دکھائی۔ میں نے پوچھا کون تھے کہنے لگے میرے سگے ماموں زاد بھائی سیّد عبدالقیوم ولد مولانا عبدالحلیم گنج مراد آبادی تھے، بھاول نگر میں زمیندار تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ پھر مجھ سے کہا کہ آج نماز جمعہ سے قبل ترک مسجد لی مارکیٹ اور رحمت مسجد بھیم پورہ کے امام

صاحبان سے ملاقات کر کے میرے لیے صحت کی اور سیّد عبدالقیوم کے لیے مغفرت کی دعا کی درخواست کرنا۔ صبح دس بجے ایک مزاج شناس مسلم لیگی پڑوسی سید امام علی آئے اور آدھ گھنٹے بیٹھے۔ پھر میرے اخبار کے ساتھی ممنون الرحمان خاں آ گئے اور میں دفتر جانے کی تیاری کے لیے اندر چلا گیا۔ اَبّا ممنون سے میری شادی کے حوالے سے گفتگو کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہم دفتر کے لیے نکل گئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد میں دفتر پہنچا تو ایک ساتھی نے اطلاع دی کہ آپ کے گھر سے ٹیلی فون آیا تھا۔ میں ابھی اندازے لگا رہا تھا کہ میرے چھوٹے بھائی وصی حیدر عمار کا پھر ٹیلی فون آ گیا۔ اُس نے اطلاع دی کہ اَبّا کی طبیعت خراب ہے گھر آ جائیں۔ گھر پہنچا تو اَبّا بستر پر لیٹے ہوئے تھے، آنکھیں بند تھیں اور پورا گھر اُن کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کلائی اور ٹخنے کے پاس سے نبض دیکھی۔ دل کی حرکت سننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ فوری طور پر ایک پڑوسی کی گاڑی میں وصی حیدر اور میں اَبّا کو لیکر بقائی اسپتال پہنچے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے معائنہ کر کے تصدیق کر دی کہ اَبّا اللہ کی رحمت میں پہنچ گئے ہیں۔ ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی۔ وصی حیدر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، میں نے تسلی دی اور اَبّا کی میت ایمبولینس میں رکھ کر گھر آ گیا۔ ایمبولینس دروازہ پر رُکی تو کہرام مچ گیا۔ امّاں نے سر پیٹ لیا۔ زاہدہ بے ہوش ہوگئی، خالدہ اور راشدہ نے بال نوچ لیے۔ شاہدہ کے ہاں پچھلے ماہ ولادت ہوئی تھی لہٰذا وہ گھر پر تھی۔ اشرف حیدر آباد میں تھیں۔ سب کو اطلاع کی۔ اَبّا کی وصیت کے مطابق کفن دفن کے لیے اَبّا کے دوست عبدالستار ایدھی کو اطلاع دی۔ وہ فوراً پہنچ گئے۔ اَبّا کے ایک ماموں سیّد رحمت علی، میرے خالہ زاد بھائی ولایت حسین، میرے بہنوئی صادق حسین اور میرے ایک دوست قاسم صولت نے غسل دیا۔ حیدر آباد سے

اشرف کے کراچی پہنچنے کے بعد اَبّا کا جنازہ اٹھایا گیا۔ رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے علاوہ رحمت مسجد اور ترک مسجد کے بہت سے نمازی پہنچ گئے تھے۔ ناظم آباد کی مسجد اقصیٰ سے متصل پارک میں رحمت مسجد کے پیش امام مولانا عزیز اللہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور سخی حسن قبرستان نارتھ ناظم آباد میں تدفین کے بعد قبر پر فاتحہ ترک مسجد کے پیش امام صوفی عبدالکریم نے پڑھی۔

۱۴ رمئی ۱۹۷۶ء کو میرے دفتر جانے کے بعد اَبّا نے غسل کیا اور جمعہ کی نماز کے لیے کپڑے تبدیل کیے۔ اسی اثنا میں اُن کو ایک مرتبہ پھر سینے میں درد محسوس ہوا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گئے اور امّاں کو آواز دی کہ فوراً آ جاؤ طبیعت بگڑ رہی ہے۔ امّاں باورچی خانے سے اَبّا کے کمرے میں پہنچیں تو وہ اپنا چہرہ قبلہ رخ کر چکے تھے اور کلمہ طیبہ اُن کے ہونٹوں پر تھا۔ ۲۶ رفروری ۱۹۷۶ء جمعرات کو اَبّا نے ہرنیا کی تکلیف محسوس ہونے پر اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ ’’موت برحق ہے مگر لمبی بیماری سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ دل چاہتا ہے تیمار داروں کو زحمت نہ ہو‘‘۔ جناح اسپتال میں جب میں اُن کی کوئی خدمت کرتا مجھ سے معذرت کرتے اور کہتے تم کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اَبّا اپنے تمام کام خود کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی کو زحمت نہ ہو جبکہ انہوں نے اپنی تمام زندگی ہمارے لیے زحمت میں گزار دی۔ اَبّا کی تدفین کے بعد جب میں گھر پہنچا تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی مسافر کا راہ میں تمام اسباب لٹ گیا ہو۔ میری کیا تمام بہن بھائیوں اور امّاں کی یہی کیفیت تھی۔ ۱۵ رمئی ۱۹۷۶ء کی صبح اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں وصی حیدر، ولی حیدر اور اپنے بہنوئی صادق حسین کے ساتھ فاتحہ پڑھنے اَبّا کی قبر پر حاضر ہوا تو دیکھا رات کو قبر پر جو پھول چڑھائے تھے شبنم میں نہا کر کچھ اور نکھر گئے تھے۔

سوانحی تفصیلات کے لیے مزید دیکھیے

۱۔ قاری کی کہانی۔ قاری کی زبانی، غیر مطبوعہ، مملوکہ خواجہ علی حیدر

۲۔ "حکیم قاری احمد کا خاندان"، مرتبہ حکیم قاری احمد پیلی بھیتی، غیر مطبوعہ، مملوکہ ڈاکٹر راشدہ قاری۔

۳۔ تذکرۂ محدث سورتی، خواجہ رضی حیدر (کراچی: سورتی اکیڈمی، ۱۹۸۱ء)

۴۔ اکابرِ تحریک پاکستان، محمد صادق قصوری (گجرات: مکتبۂ رضویہ، ۱۹۷۸ء) جلد دوم۔

۵۔ اسلامک انسائیکلو پیڈیا، محمد قاسم محمود

۶۔ خفتگانِ کراچی، پروفیسر محمد اسلم (لاہور: ادارۂ تحقیقات پاکستان، ۱۹۹۱ء)

۷۔ تجلیاتِ مہرِ انور، علامہ شاہ حسین گردیزی (کراچی: مکتبۂ مہریہ گولڑہ شریف، ۱۹۹۲ء)

۸۔ وفیاتِ مشاہیرِ پاکستان، پروفیسر محمد اسلم (اسلام آباد: مقتدرۂ قومی زبان، ۱۹۹۰ء) ص ۱۲،

۹۔ مجلہ "تقریب عطائے گولڈ میڈل" (لاہور: ایوانِ کارکنان تحریک پاکستان، اگست ۲۰۰۵ء) ص ۴۵

۱۰۔ Ahmad Saeed, Muslim India (1857-1947) (Institute of Pakistan Historical Research, Lahore, June 1997)

۱۱۔ تاریخ پاک و ہند، حکیم قاری احمد پیلی بھیتی (کراچی: قرآن محل، ۱۹۷۶ء)

۱۲۔ مشاہداتِ حرمین، حکیم قاری احمد پیلی بھیتی (کراچی: سورتی دواخانہ، ۱۹۵۴ء)

۱۳۔ سلیم احمد، خواجہ رضی حیدر (کراچی: ایوانِ محدث سورتی، جون ۲۰۱۲ء)

۱۴۔ بزرگانِ کراچی، ڈاکٹر ناصر الدین صدیقی (کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۳ء)

۱۵۔ انوار علمائے اہلسنت سندھ، صاحبزادہ سید محمد زین العابدین راشدی (لاہور: زاویہ پبلشر، ۲۰۰۶ء)

۱۶۔ وفیات مشاہیر اُردو، بشارت علی خان فروغ (نئی دہلی: مکتبہ الحسنات، ۲۰۰۰ء)

۱۷۔ تاریخ رفتگاں، صابر براری (کراچی: مکتبہ قادریہ، ۱۹۸۶ء)

۱۸۔ چار امام، مرتبہ محمد آصف علیمی (کراچی: مکتبۂ علیمیہ، ۲۰۱۲ء)

ooo

میری والدہ

آغوش سے دُور

میری والدۂ محترمہ سیّدہ خاتون کا انتقال ۲۰ رجنوری ۱۹۹۱ء کو حرکتِ قلب بند ہوجانے سے ہوا تھا۔ میں امّاں کے حوالے سے بھی تقریباً سترہ سال تک اپنی یاد داشتیں قلمبند نہیں کرسکا۔ پھر ایک دن جب میں اپنے دوست یوسف تنویر کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، اچانک امّاں کی یاد آئی اور میں نے قلم برداشت کچھ لکھنا شروع کردیا۔ اس دوران مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری تھی۔ یوسف تنویر بھی ایک طرف بیٹھے میری اِس کیفیت کا جائزہ لیتے رہے۔ ڈیڑھ بجے دوپہر سے رات کے آٹھ بجے تک میرا قلم چلتا رہا۔ جب میرا قلم رُکا تو میں نے یوسف تنویر کو یہ تحریر بادیدۂ نم سنائی اور یوسف تنویر بھی آبدیدہ ہوگئے۔ رات دس بجے جب ہم گھر کی طرف جارہے تھے تو اچانک مجھے خیال آیا کہ آج ۲۰ رجنوری ۲۰۰۸ء ہے، امّاں کی برسی کی تاریخ ....سترہ سال کیسے اور کہاں بیت گئے۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ (رضی)

امّاں میں آپ کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ روز سوچتا ہوں کہ آج جب فرصت ملے گی تو تخلیہ میں بیٹھ کر آپ کے ساتھ گزارے ہوئے ایام کو آواز دوں گا اور ایک ایک بات کو یاد کرکے خوب رووٴں گا، مگر ہوتا یہ ہے کہ صبح اُٹھ کر روزگار کے حوالے سے مصروفیات کا آغاز ہوجاتا ہے۔ صبح سے شام تک قلم گھستا رہتا ہوں۔ سچ جھوٹ نجانے کیا کیا کچھ لکھتا ہوں۔ سچ لکھتے ہوئے تو قلم بھی خوب چلتا ہے۔ یاد داشت

بھی ساتھ دیتی ہے لیکن جھوٹ لکھتے ہوئے ایک جھرجھری سی آتی ہے اور قلم
لڑکھڑانے لگتا ہے۔ ایک خوف پورے جسم میں دوڑ جاتا ہے اور آپ بے اختیار یاد
آجاتی ہیں کیونکہ جھوٹ کی جو سزا اللہ میاں حشر میں دیں گے وہ تو جب ملے گی تب
ملے گی لیکن جھوٹ بولنے پر جو سزائیں آپ نے مجھے دی تھیں وہ نہ صرف اکثر یاد
آتی ہیں بلکہ اب بھی سردیوں میں میرا مزاج پوچھتی رہتی ہیں۔ امّاں میں اُن
سزاؤں پر آپ سے شکوہ گزار نہیں ہوں کیونکہ میں اگر آپ کی سزاؤں کی بنا پر جھوٹ
بولنا ترک کردیتا تو آج اپنی بیشتر تحریروں پر احباب سے داد وصول نہ کررہا ہوتا۔

امّاں۔ میں نے اتنی کثرت سے جھوٹ بولے ہیں کہ اکثر اوقات مجھ کو اپنے بولے
ہوئے جھوٹ سچ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ بعض ایسے جھوٹ ہیں جو میں نے بطور
واقعہ اپنے احباب کے سامنے متعدد بار بولے ہیں اور اُن واقعات کی جزئیات مجھ کو
اس قدر حفظ ہوگئی ہیں کہ پچیس تیس سال بعد بھی اگر کسی دوست نے کوئی واقعہ
سنانے کی فرمائش کی تو میں نے وہ واقعہ من وعن سنادیا ہے۔ اس قدر من وعن کہ
میں خودبھی اپنے اِس عمل پر حیران ہوجاتا ہوں۔

امّاں چند سال قبل سردیوں میں جب کوئٹہ کی ہوا چلی تو میری پنڈلیوں میں پھر
سے درد اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ پنڈلیوں پر زیتون کے تیل کی مالش
کی اور کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں درد کم ہوگیا اور مجھے نیند آگئی۔ صبح اٹھا
تو طبیعت بحال تھی لہٰذا اپنے معمولات میں گم ہوگیا۔ رات گھر پہنچا تو دیکھا آپ کا پوتا
خواجہ علی حیدر اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے اور اُس کی ماں اُس کے پائنتی بیٹھی زیتون کا
تیل اُس کی پنڈلیوں پر مل رہی ہے۔ میں نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے
دریافت کیا کہ کیا ہوا۔ آپ کی بہو کہنے لگی کوئٹہ کی ہوا چل رہی ہے جس کی وجہ سے
کوئی پرانی چوٹ لَو دے اُٹھی ہے۔ منع کرتی تھی کہ اندھا دھند مت کھیلا کرو۔ ہر روز

کوئی چوٹ لیکر گھر آتے ہو۔ مگر میری سنتا کون ہے"۔ وہ دیر تک نجانے کیا کچھ کہتی
رہی اور میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس لمحہ امّاں آپ مجھ کو بہت یاد آئیں کیوں کہ
آپ بھی مجھے سزا دے کر اسی طرح نہ صرف میری پنڈلیوں پر تیل ملا کرتی تھیں بلکہ
پھٹکری کی پھنکی لگوا کر گرم دودھ بھی پلایا کرتی تھیں۔ اُس لمحہ میں چاہتا تھا کہ آپ کو
یاد کرکے بہت روؤں لیکن میں ایسا کرنہیں سکا کیونکہ آپ کی یاد کے ساتھ ہی ایک
اطمینان میرے ذہن میں بیدار ہوگیا کہ چلو میرے بیٹے کی پنڈلیوں میں درد جھوٹ کی
کسی سابقہ سزا کے نتیجہ میں نہیں اٹھا ہے بلکہ موسم کی تبدیلی کا شاخسانہ ہے۔

امّاں۔ یہ جو لکھنا پڑھنا ہے وہ میرا شوق بھی ہے اور میرا روزگار بھی۔ چنانچہ
ہمہ وقت لکھنا پڑھنا میرا معمول ہوگیا ہے۔ امّاں آپ جب مجھے رات کے کسی لمحہ
سر جھکائے لکھتے ہوئے دیکھتی تھیں تو کہا کرتی تھیں کہ "اتنا مت لکھا کر نگاہ کمزور
ہوجائے گی۔ تیرا دماغ تھکتا نہیں ہے"۔ امّاں میں اُس لمحہ آپ کی ممتا بھری
معصومیت پر مسکرا کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا اور آپ دوبارہ اپنے کمرے میں
جاکر سوجاتی تھیں۔ امّاں میں کبھی آپ سے نہیں کہہ سکا کہ بحیثیت ادیب و شاعر
میری زندگی میں سچ کی مقدار بہت کم ہے۔ میرے تخیّل کے برخلافِ واقعہ باتوں
اور قصوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ میں جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو تخیّل کسی جھوٹ کو
کاغذ پر تصویر کردیتا ہے اور پڑھنے والے واہ واہ پکار اٹھتے ہیں۔ امّاں مجھے یاد ہے
آپ اکثر کہا کرتی تھیں کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اس لیے دوسروں کو برا لگتا ہے۔
اس عمر کو پہنچ کر تجربے نے مجھ پر منکشف کیا کہ سچ پر مبنی میری تحریریں مقبولیت کی سند
کیوں نہیں پاسکیں۔

امّاں میں آپ کو یاد کرنا چاہتا ہوں لیکن یکسوئی کے ساتھ ایسا کبھی کرنہیں پاتا۔
ہر مرتبہ سیکڑوں یادیں مجھے گھیر لیتی ہیں مگر میں کسی یاد کو طول دینے کے بجائے اپنے

کسی جھوٹ کے گھنگرو قلم کی نوک سے باندھ کر کاغذ پر رقص شروع کر دیتا ہوں۔

امّاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ابّا میری کسی بات پر ناراض ہو کر مجھ سے گفتگو کرنا چھوڑ دیتے تھے تو آپ اُس وقت تک مجھ کو کھانا نہیں دیتی تھیں جب تک کہ میں ابّا سے معافی نہ مانگ لوں۔ عموماً میں اپنی ہٹ دھرمی میں دو ایک روز تک معافی نہیں مانگتا تھا تو آپ مجھ سے چپکے سے کہتی تھیں ”خبیث باپ سے معافی مانگ لے۔ انہوں نے بھی دو دن سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ کیا باپ کو بھوکا مارے گا“۔ میں آپ کی التجاؤں کے نتیجے میں مردار قدموں سے اٹھ کر ابّا کے پاس جاتا اور اُوپری دل سے معافی مانگتا اور وہ سچے دل سے نہ صرف مجھے معاف کر دیتے بلکہ گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے تھے۔ پھر جب ہم سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہوتے تو ابّا فہمائش کے انداز میں مجھ سے کہتے تھے ”تو کیا سمجھتا ہے کہ تیرے بغیر میرے حلق سے نوالہ اتر جائے گا“ امّاں میں اب سوچتا ہوں کہ آپ میرا کھانا بند کرتی تھیں اور ابّا اپنے اوپر کھانا حرام کر لیتے تھے۔ یقیناً میرے بغیر اُن کے حلق سے نوالہ نہیں اترتا ہوگا لیکن امّاں شاید ابا ایسا اس لیے بھی کرتے تھے کہ وہ آپ کے اختیارات کو بحال رکھنا چاہتے تھے کیونکہ آپ اُن کی خفگی کی توثیق میں میرا کھانا بند کرتی تھیں۔ امّاں میں بھی ابّا کی طرح خواجہ علی حیدر کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ اُس کی غیر ضروری آوارگی اور آزادی پر چیختا چلاتا ہوں اور کبھی کبھی طیش میں آ کر گھر میں کھانا کھانا چھوڑ دیتا ہوں۔ مگر امّاں علی حیدر کی ماں نہ اُس پر کھانا بند کرتی ہے اور نہ ہی میں بھوکا رہتا ہوں۔

امّاں میں آپ کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ میں اب نانا ہو چکا ہوں۔ قائد اعظم اکادمی کی اُس ملازمت سے بھی فارغ ہو گیا ہوں جس کے حصول کی خاطر اور ترقی درجات کے لیے آپ دعائیں کیا کرتی تھیں اور میں ترقی کے زینے چڑھتا رہتا تھا۔

امّاں میں اپنے گھر میں موجود آسائشوں کے تناظر میں جب سوچتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اگر میری ترقیاں آپ کی دعاؤں کی مرہونِ منت تھیں تو اُن ترقیوں کے ثمرات میں آپ کا حصہ اتنا مختصر کیوں تھا۔ میری بیوی کہتی ہے کہ مرد کی آمدنی اور ترقی بیوی بچوں کے نصیب سے ہوتی ہے۔ امّاں۔ اگر ایسا ہے تو کیا آپ میرے حوالے سے میری بیوی اور بچوں کے نصیب کے لیے دعا کیا کرتی تھیں۔ مگر امّاں مجھے یاد ہے کہ جب آپ کسی لمحہ ابّا سے کہا کرتی تھیں کہ اُن کو بیوی بچوں کے مقدر سے رزق ملتا ہے تو ابّا غصّے میں آ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے ”سید“ میرے رزق کو محدود نہ کیا کرو۔ میرے دسترخوان سے یہ جو چونٹی خشکی کا کوئی ذرہ اٹھا کر لے جا رہی ہے اور یہ جو کتّا ہماری چوسی ہوئی ہڈی چوستا ہے اس کے بھی مقدر کا رزق مجھ کو ہی ملتا ہے۔ اس لیے رزق کو محدود نہ کیا کرو“۔ مگر امّاں میں ایسی کوئی نصیحت اپنی بیوی کو نہیں کر سکتا ہوں کہ وہ خود برسرِ روزگار ہے۔ بس ہر لمحہ کشادگیٔ رزق اور دسترخوان کی وُسعت کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں۔

امّاں۔ میں کسی بازار سے گزرتے ہوئے کسی ایسی چیز کو جو آپ کو مرغوب رہی ہو آج بھی دیکھ کر بلک اُٹھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ آج امّاں زندہ ہوتیں تو میں یہ چیز خرید کر اُن کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا اور آپ حسبِ عادت تیوری پر بل ڈال کر مجھ سے کہتیں کہ ”یہ کیا اُٹھا لایا۔ میں چار دن کی مہمان ہوں مجھ پر کیوں خرچ کرتا ہے“۔ پھر آپ مسکرا دیتی تھیں اور کہتی تھیں ”اللہ تجھ کو طویل زندگی دے۔ عقلمند آدمی اُس گھوڑے کا زیادہ خیال رکھتا ہے جو سفر میں دیر تک ساتھ دیتا ہے۔ تو خسارے کا سودا کر رہا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کو مقدّم رکھا کر“ .... امّاں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آدمی ماں اور بیوی کے درمیان کوئی ایسی حدِ فاصل نہیں کھینچ پاتا کہ بعد میں اُسے اپنے رویّوں پر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ امّاں۔ میں بھی ایک شرمندہ

آدمی کی طرح اپنے روز و شب پورے کررہا ہوں اور انہی روز و شب کے درمیان آپ کی یادیں منور ہوتی رہتی ہیں۔

امّاں۔ میں جب آپ کو یاد کرتا ہوں تو دنیا کی تمام عورتیں میری نظر میں ہیچ ہوجاتی ہیں۔ میں جب بچہ تھا اُس وقت بھی اور آج جب آپ کے انتقال کو سترہ سال بیت چکے ہیں اب بھی۔ نامعلوم کیوں کوئی عورت مجھے آپ سے زیادہ خوبصورت، آپ سے زیادہ وجیہہ اور آپ سے زیادہ بارعب نظر نہیں آتی ہے۔ امّاں آخر ایسا کیوں ہے۔ آپ معمولی شکل وصورت کی طویل قد خاتون تھیں۔ آپ کا فربہی مائل جسم اور سانولا رنگ تھا۔ آپ کے مقابلے میں ابّا کا رنگ بہت صاف تھا۔ شاید اسی لیے میرے رنگ کے بارے میں ابّا اکثر شرارتاً کہتے تھے کہ ''رضی اپنی امّاں پر چلا گیا''۔ ابّا کے اس جملے پر آپ کی تیوری پر بل آجاتا تھا اور آپ تنک کر ابّا سے کہتی تھیں کہ ''آپ سے زیادہ صاف رنگ میرے بیٹے کا ہے''۔ امّاں میری بیوی تو مجھے سانولوں میں بھی شمار نہیں کرتی۔ وہ تو مجھے کالا ہی کہتی ہے کیونکہ وہ خود گوری چٹی ہے۔ میں جب اُسے چھیڑنے کے لیے کہتا ہوں کہ خواجہ علی حیدر کا رنگ میری طرح ہے تو بدک جاتی ہے اور کہتی ہے ''لاحول ولا قوۃ......علی کا تو رنگ بہت صاف تھا۔ یہ تو دھوپ میں کھیل کود کر اس نے اپنا رنگ مارلیا۔ تم تو کالے ہو''۔ امّاں ایسا جب ہوتا ہے تو مجھے آپ بہت یاد آتی ہیں۔

امّاں میں آپ کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ خصوصاً اُس وقت جب میں اپنے بچپن کے دوست سیّد مشتاق علی کی والدہ سے ملنے جاتا ہوں۔ آپ کو یاد ہے نا۔ وہ آپ کی سہیلی تھیں۔ آج نوّے برس سے زائد عمر میں بھی اُن کا حافظہ تازہ ہے۔ اُن کو آپ کی ایک ایک بات یاد ہے۔ جب میں جاتا ہوں تو وہ آپ کو یاد کرکے گریہ کرتی جاتی ہیں اور اپنے مخصوص لہجہ میں مجھ سے کہتی ہیں۔ ''رضی تیری ماں بڑی شاکر و

صابر عورت تھی۔ جہاں جاتی تھی سب کو اپنا بنالیتی تھی۔ تیرے باپ کو دیوتا سمجھتی تھی۔ ہر وقت اُن کی تعریف کرتی تھی۔ سیّدانی تھی نا اس لیے اُس کی شان ہی کچھ اور تھی''۔ امّاں......مشتاق علی کی والدہ سے میں جب ملتا ہوں تو وہ مجھ سے آپ کی سی ہی شفقت اور محبت کا اظہار کرتی ہیں۔ ایسی محبت اور شفقت کا کہ میں اُن کے وجود میں آپ کو دیکھنے لگتا ہوں۔ مجھے اُن کی آنکھوں میں آپ کا عکس لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کے ہاتھوں کی ملائمیت بھی بالکل ویسی ہی ہے، جیسے آپ کے ہاتھوں میں تھی۔ میں ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر آنکھوں سے لگاتا ہوں اور پھر اُن پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہوں۔ اُس لمحہ میرے پورے وجود کو گریہ اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور میں خود کو بچہ تصور کرنے لگتا ہوں۔

امّاں آپ کو یاد ہے نا کہ کسی فرصت کے لمحہ میں ابّا جب ہم سب بہن بھائیوں کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے والدین کے حوالے سے گفتگو کرتے تھے تو عموماً وہ رونے لگتے تھے۔ خصوصاً ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد تو اُن کی یہ کیفیت شدید ہوگئی تھی۔ اُس لمحہ جب ابّا رو رہے ہوتے تھے تو ہم سب بہن بھائی ہنستے تھے کہ ابّا اس عمر کو پہنچ کر بھی اپنے والدین کو یاد کرکے رونے لگتے ہیں۔ آپ یہ منظر دیکھ کر ہم پر آنکھیں نکالتیں اور ہم ابّا کو ہنسی مذاق میں لگانے کی کوشش کرنے لگتے۔ امّاں وہ جو ابّا کی حبیبہ خالہ تھیں وہ ابّا سے محبت تو بہت کرتی تھیں لیکن اپنی طبیعت میں موجود حکمرانی کی بنا پر ابّا سے سخت و تند لہجے میں گفتگو کیا کرتی تھیں۔ اُن کو نہ ابّا کی عمر کا خیال آتا تھا اور نہ اس بات کی اُن کی نظر میں کوئی اہمیت تھی کہ ابّا نہ صرف حکیم اور عالم تھے مجھ کو حبیبہ دادی کا ابّا کے ساتھ یہ روّیہ قطعی اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر ابّا آخری دم تک اپنی خالہ کے پاس حاضری دیتے رہے۔ ہر عید الفطر پر اُن کو جوڑا اور گرگابیاں نذر کرتے رہے''۔ امّاں اُس وقت ابّا کا یہ عمل میرے لیے کوئی معنی نہیں

رکھتا تھا لیکن آج میں آپ کی بڑی بہن یعنی ''خالہ امّاں'' کو یاد کر کے کیوں آبدیدہ ہوجاتا ہوں۔ امّاں آج بھی آپ کی یاد بڑی شدت سے آتی ہے۔ مگر کیا کائنات کی کوئی عورت آپ کی کمی کو پورا کرسکتی ہے۔

امّاں میں آپ کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن جب میں آپ کو یاد کرنا چاہتا ہوں تو چپکے سے کوئی یاد میری سوچ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور میں اُس یاد کے سہارے کسی ایسے منظر میں اُتر جاتا ہوں جو میرا منظر ہوتے ہوئے بھی میرا نہیں ہوتا ہے۔ امّاں مجھے یاد ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ابّا کی الماری سے جمع شدہ کچھ روپے نکال کر ابّا کی رشتہ کی ایک بہن کو ان کی پریشانی میں بطور امداد دے دیئے تھے۔ یہ روپے ابّا کسی خاص ضرورت کے تحت جمع کر رہے تھے۔ ابّا کو جب علم ہوا تو وہ غصہ میں آگئے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جب میں اُن کی مدد کرتا ہوں تو تم نے میری اجازت کے بغیر کیسے اُن کو روپے دیدیئے۔ وہ اس قدر غصے تھے کہ آپ نے جب وضاحت پیش کرنا چاہی تو وہ آپ کی طرف لپکے۔ میں قریب ہی کھڑا تھا، لہٰذا میں نے فوراً اُن کا ہاتھ پکڑلیا۔ ابّا میری اس جرأت پر ابھی حیران کھڑے تھے کہ آپ شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑیں اور مجھے اس قدر مارا کہ میری نکسیر پھوٹ گئی۔ مجھے یاد ہے آپ مجھے مارتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں کہ ''خبیث تیری یہ جرأت کہ تو نے آج باپ کا ہاتھ پکڑلیا۔ کل تو ان پر ہاتھ بھی اٹھائے گا۔ مگر میں تجھے کل کے لیے زندہ نہیں چھوڑوں گی''۔ امّاں اُس دن آپ پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ تو ابّا ہی نے آپ کو روک لیا ورنہ آپ واقعی مجھ کو جان سے مار دیتیں۔ پھر آپ نے مجھ سے کئی دن تک بات نہیں کی اور کھانا بھی نہیں کھایا۔ بس صبح سے شام تک ڈوپٹہ سے منہ لپیٹے لیٹی رہتی تھیں۔ ایک دن اشرف کے کہنے پر جب میں نے آپ کو راضی کرنا چاہا تو آپ نے پلٹ کر مجھ سے کہا تھا کہ پہلے باپ سے معافی مانگ پھر میں

تجھ سے بات کروں گی۔ امّاں میرا بیٹا علی حیدر مجھ سے بدتمیزی تو نہیں کرتا ہے لیکن جب میں اُس کی ماں سے کسی بات پر الجھتا ہوں تو وہ مسکرا کر میرے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے اور نہایت دھیمے لہجے میں مجھ سے کہتا ہے ''بابا۔ آپ میرے سامنے امی کو کچھ نہ کہا کریں۔ وہ میری ماں ہیں اور آپ کی بیوی۔ ماں کا رشتہ کیا، بیوی کے مقابلے میں مقدس نہیں ہوتا ہے''۔

امّاں میں آپ کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کس کس حوالے سے آپ کو یاد کروں۔ آپ سے منسوب ہر ایک یاد میرے لیے بڑی مسرت خیز اور دلگیر ہے۔ آپ نہایت سخت گیر تھیں۔ میری شرارتوں، محلے کے لڑکوں کے ساتھ میرے دنگے فساد، پڑھائی کی طرف سے میری لاپروائی اور جھوٹ بولنے کی عادت سے آپ ہمیشہ عاجز رہتی تھیں۔ ابّا سے میری کوئی شکایت اس لیے نہیں کرتی تھیں کہ ابّا کا مجھے مارنا آپ کو گوارا نہیں تھا یا پھر ابّا کی سزاؤں کو میرے حق میں آپ زیادہ شدید تصور کرتی تھیں لیکن جب میری بہت سی شکایتیں آپ کے پاس جمع ہوجاتی تھیں تو کسی دن طیش میں آکر آپ اپنے ڈوپٹہ کو بل دیکر اُس کا کوڑا بناتیں اور ایک ایک بات یاد کر کے مجھے اُس کوڑے سے مارتی رہتی تھیں۔ کبھی آپ پر اس قدر جلال آجاتا کہ آپ مجھے مارتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں کہ ''میں اپنے باپ سیّد بشارت علی موسوی کی اولاد نہیں جو تجھ کو آج زندہ چھوڑ دوں''۔ مگر آپ باوجود قسم کھانے کے ہر بار مجھے زندہ چھوڑ دیتی تھیں۔ امّاں آپ مجھے شاید اس لیے زندہ چھوڑ دیتی تھیں کہ میں زندہ رہوں اور آپ کو یاد کرتا رہوں۔ آپ کی سختیوں میں لپٹی اس ممتا کو روتا رہوں جو انسان کے نصیب میں صرف ایک بار آتی ہے۔ امّاں مجھے یاد آیا کہ جب مجھے رات کو نیند نہیں آتی تھی تو آپ اپنے ڈوپٹہ کا پلّو میرے چہرے پر ڈال دیتی تھیں اور مجھ کو نیند آجاتی تھی۔ امّاں اب مجھے گھنٹوں نیند کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بستر پر کروٹیں

لیتا رہتا ہوں لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور رہتی ہے۔ اُس لمحہ مجھے آپ کے ڈوپٹہ کا پلّو بہت یاد آتا ہے اور میں بلک بلک کر رونے لگتا ہوں۔ اسی رونے کے دوران پھر کسی لمحہ مجھ کو نیند آجاتی ہے اور جب میں صبح بیدار ہوتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے چاروں طرف آپ کی خوشبو مہک رہی ہو۔

امّاں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں ایک مرتبہ مغرب کے بعد میں کھارادر میں اپنے فلیٹ کی گیلری میں بیٹھا ہوا ابّا کی مطب سے واپسی کا انتظار کررہا تھا کہ ایک وہم نے نامعلوم کیوں میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُس لمحہ میں نے یقیناً اُس وہم سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کی ہوگی لیکن میری کوشش کے باوجود یہ وہم میرے پورے وجود میں تیزی سے سرایت کرگیا اور میں زار وقطار رونے لگا۔ میں اتنا رویا کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ اشرف کسی کام سے گیلری میں آئی تو اُس نے مجھے اس طرح روتے دیکھ کر پہلے تو خود سبب پوچھا اور پھر دوڑ کر آپ کو باورچی خانے سے بلالائی۔ مجھے یاد ہے آپ نے نہایت گھبراہٹ کے عالم میں مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا اور اپنے ڈوپٹہ سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ ''بیٹا کیا بات ہے۔ کیا پیٹ میں درد ہورہا ہے''۔ میں ابتداً خاموش رہا لیکن آپ نے جب دوبارہ مجھ سے رونے کا سبب دریافت کیا تو میں نے سہمی اور سسکتی ہوئی آواز میں آپ کو بتایا کہ ''امّاں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ابّا کا انتقال ہوگیا ہے اور میں یتیم ہوگیا ہوں''۔ امّاں مجھے یاد ہے کہ میں ابھی اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ آپ نے مجھے اپنی آغوش سے دُور دھکیل کر میرے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور چیختے ہوئے کہا۔ ''خبیث تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ مریں اُن کے دشمن۔ تیرے منہ میں خاک۔ خبیث تیرے ذہن میں یہ خیال آیا کیسے''۔ پھر آپ نے اشرف سے کہا کہ عشاء کا وقت ہورہا ہے۔ اسے وضو کرواکر نماز پڑھوا تاکہ یہ باپ کی درازیٔ عمر کے لیے دعا

مانگے۔ مگر امّاں اس سے پہلے کہ میں وضو کرتا اور نماز پڑھتا آپ مصلے پر کھڑی ہوگئی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ آپ کے پورے وجود پر کپکپی طاری تھی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اشرف نے مجھے آپ کے برابر میں کھڑا کردیا اور پھر نماز سے فارغ ہوکر آپ نے جب دعا کو ہاتھ اٹھائے تو آپ مجھ سے زیادہ رورہی تھیں۔ اشرف پانی کا کٹورا لیے آپ کے پاس کھڑی مجھے گھور رہی تھی جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو کہ ''تو سب کو اذیّت دینے کے لیے پیدا ہوا ہے''۔

امّاں آپ کو یاد ہے کہ اس واقعہ کے بائیس تیئیس سال بعد جب ابّا پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہوگئے تو آپ نے گھبراکر مجھ سے کہا تھا کہ ''رضی جلدی جا اور ڈاکٹر کو لے کر آ......لیکن میں ابّا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر جب اس کوشش میں کچھ تاخیر ہوگئی تو آپ نے بپھر کر میرے ایک طمانچہ رسید کیا اور نہایت غصّہ میں مجھ سے کہا ''رضی یہ کیا کررہا ہے۔ ڈاکٹر کو بلاکر لا۔ میرا چراغ بجھ رہا ہے''۔ ...... امّاں ابّا کے انتقال کے بعد جب ہم ایک ساتھ دسترخوان پر بیٹھے تو میں نے ابّا کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ اس لمحہ آپ نے گلوگیر آواز میں مجھ سے کہا تھا۔ ''دیکھ رضی تیرے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اور میں قسمت پھوٹی بیٹھی ہوئی ہوں''۔ امّاں اس لمحہ تو نہیں لیکن بعد میں کئی دفعہ میرے ذہن میں اپنے بچپن کے وہم کے حوالے سے ابّا کے انتقال کا واقعہ تازہ ہوا اور ہر مرتبہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے میں نے اپنے بچپن میں اپنی یتیمی کے بارے میں نہیں سوچا تھا بلکہ آپ کو آپ کی بیوگی کی اطلاع دی تھی۔ امّاں گویا میں آپ کو ہمیشہ ذہنی اذیت دیتا رہا۔ شاید اس لیے مجھ سے پہلے آپ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں تاکہ میں اپنی گستاخیوں کو اور آپ کو یاد کرکے روتا رہوں۔ سو امّاں میں رورہا ہوں۔ مجھے اپنی آغوش میں لے لیں۔

امّاں۔ سخی حسن قبرستان میں آپ کی قبر کے برابر ایک جگہ خالی تھی۔ اُس جگہ کو

دیکھ کر میں اکثر سوچتا تھا کہ اپنے بیٹے سے کہوں گا کہ جب میرا انتقال ہو تو اسی جگہ میری تدفین کرنا۔ امّاں میں ایسا اس لیے سوچا کرتا تھا کہ میں آپ کے برابر لیٹ کر آپ سے اپنے بہت سے دکھ کہوں گا۔ آپ سے وہ سختیاں اور تلخیاں بیان کروں گا جو آپ کے انتقال کے بعد میرے روز و شب کا حصہ بنی تھیں۔ امّاں سترہ سال تک میں اُس جگہ کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا لیکن اب کی مرتبہ جب میں اپنے بیٹے کے ہمراہ عید الفطر پر آپ کی قبر پر حاضر ہوا تو یہ دیکھ کر بہت ملال ہوا کہ اُس جگہ پر کسی اور کو دفن کردیا گیا ہے۔ میں آپ کی قبر کے پائنتی کھڑا دیر تک روتا رہا۔ پھر اسی دوران مجھے ایسا لگا کہ جیسے آپ نے ایک مرتبہ پھر میری کسی گستاخی پر ناراض ہوکر مجھے اپنی آغوش سے دور دھکیل دیا ہے اور میں دربدر ہوگیا ہوں۔ مگر امّاں میں کسی بھی مٹی سے اٹھوں، کسی بھی دیار سے اٹھوں، آپ کی یاد میرے ساتھ ہوگی۔

ooo

وہ ہاتھ تہہِ خاک بھی مصروفِ دُعا ہیں
دنیا میں جو اُٹھتے تھے مرے حق میں دعا کو